اشاعتِ خاص: مسجدِ اقصیٰ نمبر

ماہنامہ

براہِ راست

لاہور

جلد 11 شمارہ 09

ستمبر 2025ء

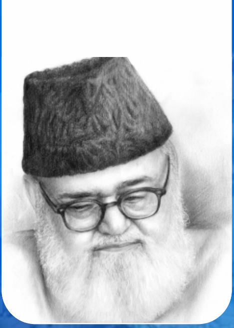

مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے قلم سے

مسجدِ اقصیٰ | آخری بار کِسے پکار رہی ہے؟ عالم عرب و عجم تباہ کر رہے ہیں!

غزہ پر قبضہ کریں گے: اسرائیل
مثالی مزاحمت ہوگی: حماس

ابراہیمی معاہدہ: پسِ پردہ حقائق اور نتائج
مفتی تقی عثمانی کے قلم سے

فلسطینی ریاست تسلیم کرنے والے
اسرائیل کی سپورٹ کر رہے ہیں

میری وصیت اور میرا آخری پیغام!

اگر آپ تک یہ الفاظ پہنچ گئے ہیں تو جان لیجیے کہ اسرائیل مجھے قتل کرنے اور میری آواز کو خاموش کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ گواہ ہے کہ میں نے اپنی ساری طاقت اور سارا زور صرف کیا تاکہ اپنے عوام کا سہارا اور ان کی آواز بن سکوں، جب سے میں نے مہاجرین کے جبالیا کیمپ کی گلیوں اور کوچوں میں آنکھ کھولی۔ میری آرزو تھی کہ اللہ میرا وقت اتنا دراز کرے کہ میں اپنے گھر والوں اور پیاروں کے ساتھ اپنی اصل بستی عسقلان (المجدل) لوٹ سکوں، مگر اللہ کی مشیت پہلے تھی اور اس کا حکم نافذ ہو گیا۔

میں نے درد کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ جیا اور بارہا جدائی اور نقصان کا ذائقہ چکھا، اس کے باوجود میں نے کبھی بھی سچ کو جیسا ہے ویسا بیان کرنے میں کوتاہی نہیں کی، نہ اسے بگاڑا اور نہ ہی چھپایا، شاید اللہ گواہ ہو ان پر جو خاموش رہے، ان پر جو ہمارے قتل کو قبول کر گئے اور ان پر جنہوں نے ہماری سانسوں کو قید کیا اور جنہیں ہمارے بچوں اور عورتوں کے جسموں کے ٹکڑے بھی نہ ہلا سکے اور نہ ہی انہوں نے وہ قتلِ عام روکا جو ہمارے عوام پر دو سال سے جاری ہے۔

میں آپ کو وصیت کرتا ہوں کہ فلسطین کو یاد رکھنا، جو مسلمانوں کے تاج کا موتی اور دنیا کے ہر آزاد انسان کے دل کی دھڑکن ہے۔

میں آپ کو وصیت کرتا ہوں کہ اس کے لوگوں کو یاد رکھنا، اس کے مظلوم ننھے بچوں کو، جنہیں زندگی نے خواب دیکھنے اور امن وسکون میں جینے کا موقع ہی نہ دیا۔

ان کے پاکیزہ جسم ہزاروں ٹن اسرائیلی بموں اور راکٹوں کے نیچے پیس ڈالے گئے اور ان کے ٹکڑے دیواروں پر بکھر گئے۔

میں آپ کو وصیت کرتا ہوں کہ نہ پابندیاں آپ کو خاموش کریں اور نہ سرحدیں آپ کو روکیں، بلکہ آپ اس سرزمین اور اس کے لوگوں کی آزادی کے لیے پُل بنیں، یہاں تک کہ عزت اور آزادی کا سورج ہمارے غصب شدہ وطن پر طلوع ہو۔

میں آپ کو اپنے گھر والوں کے بارے میں بھی وصیت کرتا ہوں، میری آنکھوں کی ٹھنڈک، میری پیاری بیٹی شام، جسے میں ویسا بڑا ہوتا نہ دیکھ سکا جیسا میں نے خواب دیکھا تھا اور میرے پیارے بیٹے صلاح کے بارے میں، جس کے لیے میں چاہتا تھا کہ میں اس کا سہارا اور ہم سفر بنوں، یہاں تک کہ وہ مضبوط ہو کر میرا بوجھ بانٹے اور میری مشن کو آگے بڑھائے۔

میں آپ کو اپنی پیاری والدہ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، جن کی دعاؤں کی برکت سے میں جو کچھ بنا وہ بنا۔ ان کی دعائیں میرا قلعہ اور میرے راستے کا نور تھیں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان کے دل کو مضبوط رکھے اور انہیں میری طرف سے بہترین بدلہ دے۔

اور میں آپ کو اپنی شریکِ حیات، اپنی پیاری بیوی ام صلاح بیان کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، جس سے جنگ نے مجھے دنوں اور مہینوں تک جدا رکھا، مگر وہ عہد پر قائم رہی، زیتون کے اس تنے کی طرح جو نہیں جھکتا۔ صابرہ ومحتسبہ، جس نے میری غیر موجودگی میں پوری طاقت اور ایمان کے ساتھ امانت کو اٹھائے رکھا۔

میں آپ کو وصیت کرتا ہوں کہ ان سب کا سہارا بننا اور اللہ کے بعد ان کے لیے ڈھال اور پشت پناہ ہونا۔

اگر میں مر گیا تو میں اپنے اصول پر ڈٹا ہوا مروں گا اور اللہ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں اس کے فیصلے پر راضی ہوں، اس سے ملاقات پر ایمان رکھتا ہوں، اور یقین رکھتا ہوں کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

اے اللہ! مجھے شہداء میں قبول فرما، میرے پچھلے اور آئندہ کے گناہ معاف فرما اور میرے خون کو میرے عوام اور میرے اہل کے لیے آزادی کا چراغ بنا دے۔

مجھے معاف کرنا اگر میں نے کمی کی اور میرے لیے دعا کرنا کہ اللہ مجھے اپنی رحمت سے نوازے، کیونکہ میں عہد پر قائم رہا، نہ بدلا اور نہ بدلا یا۔

غزہ کو نہ بھولنا

اور مجھے بھی اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھنا۔

انس جمال الشریف

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام یعنی (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گردا گرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم اسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔ بیشک وہ سننے والا (اور) دیکھنے والا ہے۔

ماہنامہ

براہِ راست

لاہور

جلد 11 شمارہ 09 ستمبر 2025ء

مُدیر: مرزا محمد الیاس

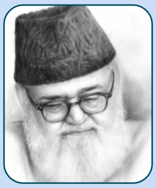

مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی

ابراہیمی معاہدہ: پس پردہ حقائق اور نتائج

ویب سائٹ: www.barah-i-rast.com

برقی پتہ ادارتی امور: editor@barah-irast.com

برقی پتہ انتظامی امور: contact@barah-i-rast.com

Price Rs.70

پبلشر مرزا محمد الیاس نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر 9/1A رائل پارک لاہور سے شائع کیا

اس شمارے میں

- کلام اقبال
- اداریہ

مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس تاریخ کے جھرونکوں سے

مسجد اقصیٰ: عرب اور مسلم ممالک بھی تباہ کر رہے ہیں

آخری پہریدار: یروشلم میں رات ایسے اتری جیسے پرسہ دینے آئی ہو

غزہ پر قبضہ کریں گے، اسرائیل: مثالی مزاحمت ہوگی، حماس

- فلسطینی ریاست: مغرب کا پروپیگنڈہ؟
- امریکی شخصیات: مغربی کنارے کی یہودی بستیوں میں
- مغربی ضمیر کی بیداری یا صہیونی ریاست کو بچانے کی آخری کوشش؟
- غزہ سٹی: اسرائیل کا بڑا حملہ، حماس نشانہ
- مغربی کنارے کے دیہی علاقے آبادکاروں کے نشانے پر
- کولمبیا کے صدر تیری غیرت کو سلام
- دور صحابہ کا آدمی، حکم العیسیٰ ابو عمر السوری
- جبالیہ کے گھرانے کی کہانی۔۔ یوسف کی زبانی

کلامِ اقبال

رِندانِ فرانسیس کا میخانہ سلامت

پُر ہے مئے گُلرنگ سے ہر شیشہ حلب کا
ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملُوکیّتِ انگلیس کا کچھ اور
قِصّہ نہیں نارنج کا یا شہد و رَطَبْ کا

......☆☆............☆☆............☆☆......

......فلسطینی عرب سے......

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش تیرے وجُود میں ہے
تری دَوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہُود میں ہے
سُنا ہے میں نے غُلامی سے اُمّتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذّتِ نمُود میں ہے

......☆☆............☆☆............☆☆......

......دَامِ تہذیب......

جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ میرا دِل
تدبیر سے کھُلتا نہیں یہ عُقدۂ دُشوار
تُرکانِ 'جفا پیشہ' کے پنجے سے نکل کر
بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

اداریہ

غزہ پر قبضہ؟

اسرائیل نے اگست میں غزہ پر قبضہ کرنے کا اعلان کیا تھا جسے عالمی ردعمل کے ازالے کے لیے ’’ٹیک اوور‘‘ کا نام دیا گیا۔اس سے قبل اسرائیلی پارلیمنٹ[کنیسٹ] نے ایک مسودہ قانون کے ذریعے مغربی کنارے کوضم کرنے کا اعلان کیا جس پر عرب دنیا نے رسمی طور پر بھی مذمت یا اسے مسترد کرنے کا نہیں کہا۔اسی طرح مقبوضہ بیت المقدس میں توسیع پسندی کے منصوبے تیز کر دیے گئے۔

غزہ پر قبضے کا اعلان سیاسی تھا۔اسے فوجی جارحیت کے طور پر نمایاں کیا گیا۔اس قبضے کے لیے فوج تیار تھی اور نہ اس میں اس حملے کی سکت تھی جس سے یہ قبضہ ممکن ہو سکتا۔اس کے لیے کسی فوجی منصوبہ کا اعلان بھی نہیں کیا گیا۔اگر کسی نوعیت کی حکمت عملی کا کہا بھی گیا تو یہ کہ پہلے دو مہینوں میں غزہ سٹی خالی کرایا جائے گا۔اس کے لیے بھی ساٹھ ہزار ریزروفوجی طلب کیے گئے۔ان کی بھاری تعداد نے حاضر ہونے سے بھی انکار کر دیا۔

اسرائیل کی فوج دو سال سے انسان کش اور نسل کش مہمات میں ملوث ہے۔اس نے ہر طرح کے انسانیت سوز مظالم کا ارتکاب کیا ہے۔پورے خاندان، محلے اور علاقے تباہ و برباد کر دیے گئے،نوزائیدہ بچوں اور شیر خوار بچوں کے حلقوم کاٹ کر ان کی ویڈیوز میڈیا کو دکھائی گئیں۔آٹا لانے والی گاڑیوں پر فائرنگ کے علاوہ لینے والوں کے ہجوم پر کئی مرتبہ گولیاں برسائی گئیں۔

اس نوعیت کے بے شمار قتل عام کیے گئے،ان کی سرپرستی امریکی صدر جو بائیڈن کی نگرانی میں برسرعام کیے گئے۔صدر ٹرمپ کی وائٹ ہاؤس میں آمد زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔غزہ کو ساحلی تفریح گاہ میں تبدیل کرنے کے لیے جارحیت میں اضافہ ہوا۔غزہ خوراک فاؤنڈیشن کی صورت میں نسل کشی نے نیا روپ اختیار کیا۔

حال ہی میں سامنے لائی گئی فلسطین کونسل برائے حقوق انسانی (PCHR)، اقوام متحدہ کے معتوب ادارے انرو، محققین کے گروپ فورینزک آرکیٹیکچر (Forensic Architecture)اور دیگر اداروں کی رپورٹوں میں شہریوں اور ان کی رہائشی کالونیوں پر حملوں، انفراسٹرکچر کی بے پناہ تباہی، فوڈ ویئر ہاؤسز کی بربادی، گینگ بنا کر لوٹ مار کرنے اور مواصلاتی سیاروں سے حاصل امیجز کے ذریعے اہم تنصیبات کی تباہی کے منصوبے مکمل کیے گئے۔اس طرح امریکی سپیس ٹیکنالوجی کے استعمال کے نئے طریقے دنیا نے دیکھے۔

اسرائیل نے غزہ کے شہری غذائی نظام کی منظم بمباری سے تباہی اور اس کے بجائے امریکی سرپرستی میں نام نہاد امدادی خوراک کے مراکز پر فلسطینیوں کے روزانہ قتل عام کو معمول بنایا گیا۔سال 2025ء کے آغاز سے ہی اس امدادی خوراک کو نشانہ بنایا گیا جو انروا، بین الاقوامی این جی اوز اور کمیونٹی نیٹ ورکس کے ذریعے غزہ پہنچ رہی تھی۔پھر 31 مارچ سے غزہ میں امدادی خوراک، پانی، ادویات، پھل، سبزی، غرض یہ کہ کھانے والی ہر شے کا داخلہ بند کر دیا گیا۔اس طرح غزہ میں مصنوعی قحط پیدا کر دیا گیا۔

اپریل تا جون اس مصنوعی غذائی قحط کو سختی سے نافذ کیا گیا۔عالمی دباؤ پر اس میں برائے نام نرمی کی گئی۔یہ نرمی مئی کے آخر میں کی گئی۔جب غزہ خوراک فاؤنڈیشن کے مراکز، پہلے چار اور حال ہی میں بارہ سے غذائی امداد قدرے دی جانے لگی تو سنائپرز، ڈرون اور فوجی فائرنگ سے موت بھی برابر تقسیم کی جانے لگی۔اس موت کی تقسیم کے نظام نے امداد کے لیے آنے والوں کو سینکڑوں کی تعداد میں مارنا شروع کر دیا۔

اسرائیل کو غزہ پر قبضہ کرنے کی ’’اجازت‘‘ دی گئی ہے۔اب غزہ سٹی میں اس کی قابض فوج حملے کر رہی ہے۔فلسطینیوں کو بھاری بمباری سے قتل کیا جا رہا ہے۔صاف دکھائی دے رہا ہے کہ مقصد صرف اور صرف مارنا ہے،قتل کرنا ہے۔اس فوج نے اپارٹمنٹس بلاک پر بمباری کی ہے۔

اگر صرف ان میڈیا سنٹرز کی رپورٹس پر غور کیا جائے تو ہولناک بہیمت کی مثالیں اس دور جدید میں سامنے آتی ہیں۔بی بی سی کے مطابق انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف جینوسائیڈ سکالرز (IAGS) کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے یہ حملے نسل کشی کی یو این کنونشن کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔اس ایسوسی ایشن نے تین صفحات کی قرارداد پاس کی ہے۔اس میں اسرائیل کے 22 ماہ پر محیط حملوں میں نسل کشی کے جملہ حملے بیان کیے گئے ہیں۔ان واقعات کو Genocide کے اقدامات، جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم قرار دیا گیا ہے۔ایسوسی ایشن نے مختصر رپورٹ میں لکھا ہے کہ ان تمام سہولتوں کو باقاعدہ طور پر فوجی اہداف بنا کر تباہ کیا گیا ہے جو انسانی جان بچانے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے،ان میں صحت کے مراکز، انسانی امداد، تعلیمی مراکز، غذا اور پانی کی سہولتوں کو فوجی اہداف بنا کر نشانہ بنایا گیا ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف کا کہنا ہے کہ 50 ہزار بچوں کو مارا یا زخمی کیا گیا ہے۔اس اقدام نے فلسطینیوں کے ایک گروہ یا نسل کے طور پر برقرار رہنے کے امکانات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس ادارے نے بھی اپنی قرارداد میں کہا ہے کہ رہائشی یونٹس کو ایک ایک کر کے تباہ کیا گیا ہے۔ان پر پہلے بمباری کی گئی ہے، میزائیلوں سے حملے کیے گئے ہیں اور پھر فوج نے ان کو نذر آتش کیا ہے۔

نسل کشی کے بارے میں لکھنے والے سکالرز کا کہنا ہے کہ اسرائیل کے سیاست دانوں کے بیانات نسل کشی کا ارتکاب کرنے پر بھی فوج کو باقاعدہ پروگرام کے تحت اکساتے رہے اور مشتعل کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ وہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ غزہ کو چٹیل میدان بنا دیں گے۔

اسرائیل کو سپورٹ کرنے والے مغربی ممالک کا کردار بھی اس کی انسانیت کش پالیسیوں کی حمایت کر رہا ہے۔ اس کی ایک مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ وہ یہ پالیسی بار بار سامنے لا رہے ہیں کہ جب تک کوئی عدالت نہیں کہے گی کہ Genocide ہوئی ہے، اسرائیل کے حملوں کو ہم نسل کشی قرار نہیں دیں گے۔ ان پالیسیوں کی قیادت برطانیہ کے وزیراعظم کیئر سٹارمر کر رہے ہیں۔ یہ حکمران بار بار کہہ رہے ہیں کہ ان کے مطابق اسرائیل اپنے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔ خود اسرائیل کہہ رہا ہے کہ وہ غزہ کو صاف کر دے گا، اسے ایک بڑے پارکنگ لاٹ میں تبدیل کر دے گا۔ غزہ پر حملوں کی آڑ لے کر مغربی کنارے میں فلسطینی آبادی ختم کی جا رہی ہے۔ بین الاقوامی قوانین کو پامال کرتے ہوئے فلسطین کے آبائی علاقوں میں آبادکار یہودیوں کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ برطانیہ کے علاوہ کینیڈا، فرانس اور یورپی یونین ایک بلاک کے طور پر اسرائیل کے حملوں کو اس کے دفاع کی جنگ قرار دے رہے ہیں۔ اس جنگ میں کچھ عرب ممالک کا کردار صاف طور پر اسرائیل نوازی کی کھلی مثال بن رہا ہے۔

غزہ پر قبضہ کرانے میں امریکہ کا کردار بہت واضح اور تباہ کن ہے۔ وہ اسرائیل کو مسلسل ہتھیار اور اسلحہ دے رہا ہے۔ امریکی صدر جو بائیڈن کی پالیسیوں کو موجودہ صدر ٹرمپ نے مزید تباہ کن بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ امریکہ اقوام متحدہ کے ہر فورم پر اسرائیل کے ساتھ کھڑا ہے۔ اب جنرل اسمبلی کا اجلاس ہونے والا ہے۔ اس کے علاوہ سلامتی کونسل میں ہر اس قرارداد کو امریکہ نے ویٹو کیا ہے جس کو دنیا کے ممالک کی غالب اکثریت نے ووٹ دیا ہے۔

غزہ کے عوام نے انتہائی خراب حالات کے باوجود اسرائیل کے خلاف نہتے ہونے کے باوجود مزاحمت کی ہے۔ وہ واضح طور پر اس عزم کا اظہار کر رہے ہیں کہ وہ کسی بھی صورت میں غزہ خالی نہیں کریں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس سختی اور مخالفت کا سامنا وہ اپنی سرزمین پر کر رہے ہیں، اسے چھوڑ کر صومالیہ یا صومالی لینڈ نہیں جائیں گے، غزہ میں ہی زندہ رہیں گے اور غزہ میں ہی مرنا پسند کریں گے۔ اسرائیل غزہ پر قبضے کی جنگ موجودہ مرحلے سے پہلے بھی متعدد بار جیتنے کے کھوکھلے اعلانات کے باوجود ہار چکا ہے۔ اس نے گذشتہ سال فروری میں اعلان کیا تھا کہ وہ غزہ پر قبضہ کرنے کے قریب ہے۔ پھر یہی اعلان اس نے مارچ میں کیا، پھر مئی میں اسے خیال آیا کہ وہ غزہ پر قبضہ مکمل کرنے کو ہے۔ پھر ایک ماہ کے بعد جون میں اسرائیل کی جنگی کابینہ نے کہا کہ اب مزید دیر نہیں ہوگی۔

اصل بات یہ ہے کہ اسرائیل دو وجوہات سے ایسے اعلانات کر رہا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت کو عوام کے شدید دباؤ کا سامنا ہے، اس دباؤ کو دور کرنے کے لیے اس نے ایران پر حملہ کیا لیکن اسے اپنے انفراسٹرکچر پر ایرانی میزائل حملوں نے شدت سے یاد دلایا کہ وہ ایران تباہ نہیں کر سکتا۔ ایران کے جوابی حملوں نے اسرائیل میں عوامی احتجاج اور بے چینی نے شدت اختیار کی، سیاسی طور پر یرغمالیوں کی واپسی اور جنگ بندی کے مطالبات بڑھتے گئے، کنیسٹ میں نیتن یاہو بلاک کو سیاسی حمایت کے کھو جانے کا نقصان اٹھانا پڑا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بار بار امریکہ اور اسرائیل نے دعویٰ کیا کہ حماس کا صفایا کر دیا گیا ہے لیکن یہ بھی دعویٰ درست ثابت نہ ہو سکا۔ حالیہ اعلان پر حماس نے باقاعدہ جواب دیا اور غزہ سٹی اور اس کے اردگرد اسرائیل کی قابض فوج کو اس کی اہلیت اور صلاحیت دونوں یاد دلا دیں۔ اس صورت حال کا ازالہ کرنے کے لیے بوگس اعلانات کا سلسلہ جاری ہوا۔ ابھی یہ دعویٰ کیا گیا کہ القسام بریگیڈ کے ترجمان ابوعبیدہ شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس کی تردید نے اسرائیل کی سبکی میں اضافہ کر دیا۔

امریکہ، اس کے عرب اور مغرب کے اتحادی اس صورت سے بہت پریشان ہیں۔ غالباً یہ دوسرا موقع ہے کہ اسرائیل شکست کھا رہا ہے۔ اب یہ بات حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے کہ نسل کشی ہو یا مکمل تباہی درپیش ہو، جیسا کہ غزہ میں کیا گیا، عوام مزاحمت کے لیے تیار ہوں تو حملہ آور اور قابض فوج تباہی پھیلانے اور قتل و غارت تو کر سکتی ہے، قابض نہیں ہو سکتی۔

دنیا بھر میں فلسطین کی آزادی اب ایک توانا آواز میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ہر مغربی ملک، امریکہ اور کینیڈا میں عوام سڑکوں پر ہیں۔ اسرائیل کے قبضہ کرنے کے عزائم کو عوامی سطح پر مسترد کیا جا رہا ہے۔ اس نے اس دو سال کی نسل کشی کی مہم میں جو کچھ کمایا ہے، وہ نفرت کے سوا کچھ نہیں۔

ہر ذی شعور اب اس حقیقت کو خود محسوس کرنے لگا ہے کہ اس قدر شدید تباہی کے باوجود غزہ میں متبادل حکومت لانے کا خواب پورا ہی نہیں ہو سکا۔ حماس کا متبادل کسی کو بھی نہیں مل سکا۔ حکومت کے نہ ہونے کے باوجود حماس کے اثرات ختم نہیں کیے جا سکے۔ ہر مسئلے پر اس ''غائب حکومت'' نے صورت حال بیان کی ہے۔ اسرائیل کے حملوں سے ہونے والے نقصانات، شہیدوں اور زخمیوں کی درست تعداد، انفراسٹرکچر کی تباہی کی مکمل اور درست رپورٹنگ جیسے کاموں نے ثابت کیا ہے کہ حماس محض سیاسی قوت نہیں بلکہ بھرپور حکومتی ادارہ ہے۔

یہ بات اب واضح ہو چکی ہے کہ اسرائیل اور اس کے اتحادی غزہ کے عوام کو قتل کر سکتے ہیں، شکست نہیں دے سکتے۔ اس لیے غزہ پر قبضہ ایک خواب ہے۔ اسے مشرق وسطیٰ کی ساحلی تفریح گاہ نہیں بنایا جا سکتا۔

دامن خیال: ابوشمائل

مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس تاریخ کے جھرونکوں سے

جو شخص اس ماہ کی تیسری اتوار کو مسجد اقصیٰ پر ہونے والے حملے کی تصاویر دیکھے گا، وہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کرے گا؛ کیا یہ مسجد ہے یا کوئی توراتی عبادت گاہ؟ کیا مسجد اقصیٰ کا حال ہمیشہ سے ایسا ہی تھا جب سے وہ قبضے میں ہے؟ یا یہ کوئی نیا واقعہ ہے؟ اگر نیا ہے تو کیسے پیش آیا؟ آج مسجد اقصیٰ کہاں کھڑی ہے اور مستقبل میں اس کے ساتھ کیا ہونے کا امکان ہے؟ یہ بہت سے سوالات ذہن میں گردش کرتے ہیں جو جوابات کے طلبگار ہیں، اور ہم یہاں ان سوالات کے جوابات ایک ایک کر کے دینے کی کوشش کریں گے۔

اوّل: مسجد اقصیٰ کا حال قبضے کے فوراً بعد کیسا تھا؟

جب مسجد اقصیٰ پر قبضہ ہوا تو فوراً اس میں نمازیں بند ہوگئیں، حتیٰ کہ قبضے کے بعد پہلا جمعہ (9 جون 1967) بھی منعقد نہ ہو سکا۔ تاہم موشے دایان کو یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ القدس پر قبضے کو جاری رکھنے اور بین الاقوامی سطح پر اس کے لیے جواز حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسجد اقصیٰ اور چرچ آف دی ہولی سپلکر میں دوبارہ نماز و عبادات کی اجازت دی جائے۔

قابض فوج نے اردنی اوقاف کے ساتھ رابطہ کیا جو اس وقت تک مسجد اقصیٰ کی ذمہ دار تھی۔

اس وقت کے اوقاف کے سربراہ شیخ عبدالحمید السائح نے شرط رکھی کہ جمعہ کی نماز کی اجازت اس وقت ہی دی جائے گی جب قابض افواج مسجد اقصیٰ کے پورے 144,000 مربع میٹر کے رقبے سے مکمل طور پر نکل جائیں۔ جب وہ اس بات کی تصدیق کر چکے کہ فوج نکل چکی ہے (15 جون 1967 بروز جمعرات)، تو اگلے دن جمعہ کی نماز کا اعلان کیا گیا۔

اس کے بعد، جب اسرائیل نے 27 جون 1967 کو القدس کو ضم کرنے کا اعلان کیا، تو اس نے مسجد اقصیٰ اور دیگر اسلامی اوقاف کو اپنی وزارتِ مذہبی امور کے تحت لانے کی کوشش کی، لیکن اردنی اوقاف نے اس کی مخالفت کی۔ قاضی، مفتی، علما، اور القدس و مغربی کنارے کی نمایاں شخصیات نے مل کر ''الھیئۃ ال اِسلامیۃ العلیا'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس نے مسجد اقصیٰ اور دیگر مقدسات کی نگرانی کی ذمہ داری سنبھالی۔ قابض حکومت کو خدشہ ہوا کہ یہ ادارہ مغربی کنارے میں ایک متوازی قیادت بن سکتا ہے، لہٰذا اس نے مسجد اقصیٰ کو وزارتِ مذہبی امور کے حوالے کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بعد ازاں، جب اس ادارے کے سربراہ کو 25 ستمبر 1967 کو اردن جلاوطن کر دیا گیا، تو

وہ اردن کی حکومت میں وزیرِ اوقاف مقرر ہو گئے، جس سے کچھ عرصے بعد مسجد اقصیٰ اور القدس کی اوقاف دوبارہ اردنی وزارتِ اوقاف کے زیرِ انتظام آ گئیں۔ ان تمام واقعات نے مسجد اقصیٰ کی موجودہ انتظامی حیثیت کی بنیاد رکھی، جسے آج ''اسٹیٹس کو'' یا ''الوضع القائم'' کہا جاتا ہے۔

ثانیاً: ''الوضع القائم'' (Status Quo) سے کیا مراد ہے؟

''الوضع القائم'' ایک اصطلاح ہے جو بین الاقوامی قانون میں جنگوں کے بعد استعمال کی جاتی ہے، اور اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی علاقے یا مقام کی حالت اسی طرح برقرار رکھی جائے جیسے وہ جنگ سے پہلے تھی۔ بعض اوقات اس سے مراد یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ حالت جو جنگ کے بعد بن گئی، وہی برقرار رکھی جائے، اور اس کا تعین عملی صورتِ حال سے ہوتا ہے۔

مسجد اقصیٰ کے معاملے میں ''الوضع القائم'' کا مطلب یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ المبارک کی حیثیت ویسی ہی رہے جیسی 5 جون 1967 سے پہلے تھی، یعنی یہ مکمل طور پر ایک اسلامی مقدس مقام ہے، اور اس کے تمام انتظامی امور ایک اسلامی ادارے یعنی اردنی اوقاف کے تحت ہیں، کیونکہ جنگ سے قبل وہی اس کے ذمہ دار تھے۔

القدس میں ''الوضع القائم'' کا تصور پرانا ہے، جو 19 ویں صدی میں عیسائی مقدسات کے حوالے سے سامنے آیا تھا، اور اس کی بنیاد روس۔ عثمانی جنگوں کے بعد دو مرتبہ رکھی گئی، اور دونوں بار یہی طے پایا کہ مقدسات کی حالت جیسے جنگ سے پہلے تھی، ویسے ہی باقی رہے، تاکہ کسی بھی جنگ کو ان کی حیثیت بدلنے کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

اسی اصول کی بنیاد پر، مسجد اقصیٰ کے پورے احاطے کو غیر اسلامی شناخت دینا، یا اردنی اوقاف کے انتظام میں مداخلت کرنا، یا کسی بھی غیر مسلم فرد یا گروہ کا (چاہے وہ سویلین ہو، پولیس ہو یا فوجی) زبردستی مسجد میں داخل ہونا، کسی بھی بہانے سے ''الوضع القائم'' میں غیر قانونی تبدیلی شمار ہوگی، اور اس کی کوئی شرعی یا قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔

تیسری بات: مسجد اقصیٰ المبارک کی حالت کیسے بدلی؟

مسجد اقصیٰ 58 سالہ صہیونی قبضے کے دوران ایک ایسے مقدس مقام سے، جس کی نگرانی، انتظام وانصرام اور تعمیر وترقی اسلامی اوقاف کے تحت ہوتی تھی، آہستہ آہستہ ایسے مقام میں بدل دیا گیا جہاں صہیونی قابض پولیس نے خود کو ''ذمہ دار اتھارٹیز'' کے طور پر مسلط کر لیا۔ اس کے ساتھ اسلامی اوقاف کے کردار کو محدود کر کے صرف ''مسجد میں مسلمانوں کی موجودگی کے انتظام'' تک محدود کر دیا گیا۔ اور مسجد اقصی پر منظم انداز میں روزانہ کی بنیاد پر دھاوے مسلط کیے گئے، جن کا آغاز 2003 میں انفرادی طور پر یا چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں ہوا، جو زیادہ سے زیادہ 5 افراد پر مشتمل ہوتے تھے۔ لیکن 2006 میں یہ گروہ بڑھ کر 20 افراد تک پہنچ گئے، اور وہ بھی اس شرط پر کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی گروہ مسجد کے اندر موجود ہوگا، اور اس کے باہر نکلنے کے بعد ہی دوسرا گروہ داخل ہو سکے گا۔

جبکہ آج صورتحال یہ ہے کہ ایک گروہ میں شامل دھاوا بولنے والے صہیونیوں کی تعداد 200 تک پہنچ چکی ہے، اور بیک وقت 6 گروہوں کو مسجد اقصیٰ میں گھس آنے اور دھاوا بولنے کی اجازت ہے، جس کے نتیجے میں ایک ہی وقت میں 1200 صہیونی مسجد اقصیٰ کے اندر موجود ہوتے ہیں۔

اسی طرح، صہیونیوں کے ان دھاووں کے لیے مخصوص اوقات بھی مقرر کیے گئے۔ 2008 میں ان کے لیے تین گھنٹے مختص کیے گئے، جو مسلسل بڑھتے رہے، یہاں تک کہ آج یہ وقت مجموعی طور پر چھ گھنٹے پندرہ منٹ تک جا پہنچا ہے۔ یہ وقت دو حصوں میں تقسیم ہے: پہلا حصہ چاشت کے وقت میں (9:00 سے 12:00)، اور دوسرا حصہ نماز ظہر کے بعد۔ ان اوقات کے دوران مسجد اقصیٰ کا مکمل محاصرہ کیا جاتا ہے، اور مسلمانوں کے داخلے پر سخت پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ یہ پورا عمل جو وقت کی بنیاد پر قابضین کو مسجد اقصیٰ میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے، اسے ''تقسیم زمانی'' (Temporal Division) کہا جاتا ہے۔ اس تقسیم کے تحت مسجد کی اوقات کو صہیونیوں اور مسلمانوں کے درمیان بانٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور اب بھی ان اوقات، دنوں اور داخل ہونے والوں کی تعداد میں اضافے کی کوششیں جاری ہیں۔

اس کے علاوہ، 1999 سے 2001 کے درمیان حتمی حل کی بات چیت کے دوران ''مسجد اقصیٰ کا گراؤنڈ فلور'' (کہ مسجد اقصی کے نیچے زیر زمین حصہ یہودیوں کا حق تسلیم کیا جائے) کا تصور پیش کیا گیا، جس کے ذریعے صہیونی یہ چاہتے تھے کہ فلسطینی اس بات کو تسلیم کریں کہ مسجد اقصی کے نیچے کا علاقہ ان (یھودیوں) کا ہے، مگر اس وقت یہ کوشش ناکام رہی۔

بعد ازاں، 2004 میں صہیونیوں نے ''القدس 2020 ماسٹر پلان'' کے مسودے میں مسجد اقصی کا ایک نقشہ پیش کیا، جس میں اس کی کل زمین کا تقریباً 94% یعنی کھلی جگہ کو الگ کر دیا گیا، جبکہ صرف 6% جس میں قبلی مسجد اور قبۃ الصخرۃ شامل ہیں، انہیں اسلامی مقدسات کے طور پر اوقاف کے حوالے کرنے کی بات کی گئی۔ اس کے مقابل میں باقی ایریا کو قابض اسرائیل کے بلدیہ کی نگرانی میں دینے کی کوشش کی گئی۔

2008 سے 2013 کے درمیان مسجد کے جنوب مغربی صحن میں (باب المغاربہ سے داخل ہونے کے بعد سب سے قریب جگہ میں) یہودی تسلط قائم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن موقع پر علم ہونے اور مسلمانوں کی موجودگی نے اسے ناکام بنا دیا۔اس کے بعد 2013 سے 2019 تک کوشش کی گئی کہ مشرقی صحن (باب الرحمۃ کے قریب) جگہ پر قبضہ کیا جائے، اور قابض اسرائیلی پولیس نے ''مصلی باب الرحمۃ'' کو ہڑپنے کی کوشش کی، لیکن 2019 کی ''ھبّۃ باب الرحمۃ'' نے یہ سازش بھی ناکام بنا دی۔

یہ سارا منصوبہ ''مسجد اقصی کی جگہ کے لحاظ سے تقسیم کے منصوبہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ مسجد کے مختلف حصوں کو عملی طور پر یہودیوں اور مسلمانوں کے مابین بانٹ دیا جائے، خاص طور پر مشرقی صحن کو مستقل طور پر یہودی رسومات کے لیے مخصوص کرنا۔2019 کے بعد یہودیوں کی طرف سے مسجد اقصیٰ کو یہودی رنگ دینے کی کوشش میں وقتی طور پہ کمی آئی، لیکن اس کے بعد ''منظمات الھیکل'' (ہیکل کی تنظیموں) نے ایک نیا ایجنڈا اپنایا جس کا مقصد یہ ہے کہ مسجد اقصی میں مکمل توراتی رسومات نافذ کی جائیں، اور ''ہیکل'' کے افسانوی وجود سے متعلق تمام رسومات مسجد اقصی میں ادا کی جائیں، گویا وہ اقصی کو ہی توراتی ہیکل سمجھ رہے ہوں، حالانکہ وہ اپنی عمارتوں اور حقیقت میں مکمل اسلامی ہے۔

یہی عمل ''مزعومہ سلیمانی ٹیمپل کی معنوی بنیاد'' کہلاتا ہے، جسے وہ اپنے مادی ہیکل کی تعمیر کا پہلا قدم سمجھتے ہیں۔

چوتھا نکتہ: قابض صہیونی ریاست کی مسجد اقصی کے بارے میں کیا سوچ ہے، اور کیا یہ ماضی میں مختلف تھی؟

قابض ریاست کی موجودہ سوچ مسجد اقصی کے بارے میں یہ ہے کہ اسے مکمل طور پر مٹا کر اس کی جگہ پر سلیمانی ہیکل (یعنی یہودی عبادت گاہ) تعمیر کیا جائے، (جسکا کبھی تاریخ میں وجود ہی نہیں رہا ہے) اور یہ ہیکل مسجد اقصی کی پوری زمین پر قائم ہو۔یعنی کہ صہیونی منصوبہ صرف زمین یا آبادی پر قبضہ تک محدود نہیں، بلکہ اب یہ دینی سطح پر قبضے کی طرف بڑھ رہا ہے، جسے ''دینی استعمار'' یا ''مقدسات پر قبضہ'' بھی کہا جا سکتا ہے۔

یہ قبضہ صرف مسجد اقصی تک محدود نہیں، بلکہ مسجد ابراہیمی (الخلیل)، مسجد بلال بن رباح (بیت لحم)، یوسف دُوَیکات کی قبر (نابلس)، اور قدس و فلسطین کے دیگر مزارات، قبریں، اور تاریخی اسلامی آثار بھی اس صہیونی ہدف کا شکار ہیں۔

اس طرح، مسجد اقصی صرف ایک علامت ہے، مگر اصل منصوبہ اسلامی شناخت اور ورثے کو مٹا کر صہیونی دینی و تہذیبی قبضے کو پورے فلسطین میں نافذ کرنا ہے۔صہیونی منصوبہ اب صرف مسجد اقصی پر قبضے یا اس میں دخل اندازی تک محدود نہیں، بلکہ مسجد کو مٹا کر اس کی جگہ پر ایک یہودی معبد قائم کرنا ان کا واضح، دیرینہ اور اب فعال منصوبہ بن چکا ہے۔

صہیونی ریاست کی مسجد اقصی سے متعلق سوچ مختلف ادوار میں بدلتی رہی ہے، اور ہر دور کی قیادت کے مطابق اس میں تبدیلی آتی گئی:

1. یورپی نوآبادیاتی ذہنیت (حزب العمل/ لیبر پارٹی):

جب صہیونی ریاست کی قیادت یورپی استعمار کی سوچ رکھنے والی جماعت ''حزب العمل'' کے پاس تھی، تو ان کا مقصد مسجد اقصی پر قبضہ کرنا تھا۔ یہ مقصد 1967ء میں پورا ہو گیا جب اسرائیل نے مشرقی القدس شہر اور مسجد اقصی پر قبضہ کیا۔

2. دائیں بازو کی صہیونی قوم پرستی (حزب اللیکود):

بعد میں جب حزب اللیکود جیسی شدت پسند دائیں بازو کی جماعتیں اقتدار میں آئیں، جن کی ''یہودی قومیت'' کی تعریف توراتی مفہوم سے آتی ہے، تو مسجد اقصی کو ہیکل میں تبدیل کرنا (معبد) ان کی یہودی شناخت کا بنیادی حصہ بن گیا۔

اس لیے ان کا مقصد مسجد اقصی پر مکمل صہیونی حاکمیت قائم کرنا تھا۔

اسی نظریے کے تحت:

- 1996 میں مسجد کے نیچے سرنگ کھودی گئی
- 2000 میں ایریل شارون نے اشتعال انگیز انداز میں مسجد میں داخل ہوئے
- 2003 سے باقاعدہ یہودیوں کے مسجد اقصی میں گھس آنے اور دھاوا بولنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

3. موجودہ مرحلہ: دینی صہیونیت:

آج جب مذہبی صہیونی جماعتیں (Religious Zionists) طاقت میں آ چکی ہیں، تو مسجد اقصی کو ختم کر کے اس کی جگہ ہیکل قائم کرنا ان کا واضح ہدف بن چکا ہے۔

یہ سوچ اب صرف شدت پسندوں تک محدود نہیں بلکہ حکومت، پارلیمان، اور سیکیورٹی اداروں تک پھیل چکی ہے، کیونکہ یہ سب ''حزب اللیکوڈ'' کی سرپرستی میں کام کر رہے ہیں۔

خلاصہ: ''تقسیم زمانی''، ''تقسیم مکانی'' اور ''تاسیس معنوی للھیکل'' یہ سب مرحلہ وار ایسے اقدامات ہیں جو مسجد اقصیٰ کو ایک خالص اسلامی مقدس مقام کے درجے سے یہود و مسلم کے درمیان مشترکہ مقام میں تبدیل کرنے کی عبوری کوششیں ہیں، تاکہ بالآخر اس کی اسلامی شناخت کو مکمل طور پر مٹا دیا جائے اور اسے ایک خالص یہودی ہیکل میں بدل دیا جائے۔

پانچواں نکتہ: مسجد اقصیٰ اس وقت یہودیت مسلط کرنے کے راستے میں کہاں کھڑا ہے؟ اور اس پر متوقع آئندہ حملے کی حد کیا ہے؟

انتقالی مرحلے کا پہلا ہدف افسوسناک طور پر حاصل کیا جا چکا ہے۔قابض صہیونی حکومت نے مسجد اقصیٰ میں اسلامی شناخت کے متوازی ایک یہودی۔توراتی شناخت عملاً مسلط کر دی ہے۔اب مسجد اقصیٰ ایک ایسا ''مشترکہ مقدس مقام'' بن چکا ہے جس میں بیشتر ایامِ سال یہودی رسومات بھی اسلامی نمازوں کے ساتھ ساتھ ادا کی جاتی ہیں، اور یہ اب کسی کی آنکھ سے اوجھل نہیں۔

چونکہ یہ ایک عبوری اور جزوی ہدف تھا، اس لیے اب قابض حکومت اگلے مرحلے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے گی۔ یہ متوقع دو راستوں میں ہو سکتی ہے:

1. یہودی شناخت کو مزید مستحکم کرنا:

اس میں مزید صہیونیوں کے مسجد پہ دھاوے اور گھس آنا، زیادہ وقت تک موجودگی، زیادہ تعداد میں توراتی رسومات، یہاں تک کہ قربانی کی ادائیگی، اور توراتی علامتوں کو مسجد میں استعمال کرنا شامل ہے۔

2. یہودی عبادت گاہ (کنیس) قائم کرنا:

مسجد اقصیٰ کے اندر باقاعدہ ایک یہودی عبادت گاہ یا کنیس قائم کر کے یہودی وجود کو مستقل اور نمایاں شکل دینا۔اس کے لیے ممکنہ طریقے یہ ہو سکتے ہیں:

۔مسجد کے کسی مخصوص حصے کو مستقل طور پر یہودیوں کے لیے مخصوص کر دینا۔

۔مسجد کی حدود میں تبدیلی کی کوشش، خصوصاً جنوب مغربی کونے میں، جس کا زیرِ زمین حصہ نودہائیوں سے مرمت طلب ہے۔

یہ تمام اقدامات مسجد اقصیٰ کی مکمل یہودیت کی طرف ایک خطرناک پیش رفت ہیں۔

تجزیہ: ابوالعین

مسجد اقصیٰ: عرب اور مسلم ممالک بھی تباہ کر رہے ہیں

کچھ تو اصل میں ایسا ہے جس نے ان سب کو بہت گہرائی میں پریشانیوں کے گرداب میں دھکیل رکھا ہے، یہ عرب سفارت کار ہوں یا مغرب کے سفارتی بزرجمہر، اب اسرائیل کے سیاسی اعلانات محض راہ میں اڑتی دھول سے زیادہ اہمیت بھی نہیں رکھتے۔

اسی طرح سے اسرائیلی سیاست دانوں کی سچائی بھی راہ میں اڑتی خاک سے زیادہ نہیں رہ گئی۔ یہ خود کو دیانت دار قرار دے رہے ہیں لیکن ان کے ارادے کھل کے سامنے آچکے ہیں۔

غزہ میں اسرائیل نسل کشی کا دوسرا سال پورا کرنے کو ہے۔ ہم ماضی پر ایک سرسری نگاہ ہی ڈالیں تو صاف دکھائی دے رہا ہے کہ 7 اکتوبر 2025ء کو اسرائیل نے جو اعلانات کیے تھے، غزہ اور فلسطینیوں پر تباہی مسلط کرنے کے جس ایجنڈے کا اعلان کیا تھا، اس پر مرحلہ وار عمل کر دیا گیا ہے۔ اس نے غزہ کے سارے شہر کو تباہ و برباد کر دیا ہے، ہر محلہ بارود کے ملبے کا ڈھیر بنا دیا ہے اور پورے غزہ کو روئے زمین سے صاف کر دیا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ، عالمی اتفاق رائے اب اس طرف منتقل ہو گیا ہے کہ غزہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسے مکمل نابود کرنے اور منظم بھوک سے انجینئر کیا گیا قحط ہے۔ اب تو تباہی کے بعد کی تباہی ہے، جس سے غزہ گزر رہا ہے، اس کے باوجود اسرائیل جو کچھ کرتا جا رہا ہے، دنیا محض دیکھے جا رہی ہے۔ لیکن تباہ کرنے کے اعلانات اور بیانات تو اب بھی رکھنے اور تھمنے میں نہیں آرہے۔ ان کے ساتھ ہی اقدامات میں بھی کوئی رکاوٹ نظر بھی نہیں آرہی۔ مقبوضہ مغربی کنارے، بیت المقدس، بالخصوص مسجد اقصیٰ، ان سب کو اسرائیل ضم کرتا جا رہا ہے (یوں کہیے کہ ڈکار لیے بناء ہضم کرتا جا رہا ہے)۔ اشتعال بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

یک طرفہ اقدامات:

گزشتہ ایک ماہ میں اسرائیلی کنیسٹ نے ایک علامتی لیکن سیاسی اعتبار سے نہایت اہم بل پاس کیا ہے۔ اس کے ذریعے مغربی کنارے کو اسرائیل میں ضم کرنے کی منظوری دی گئی ہے۔

اس سے قبل جولائی کے آخر میں اسرائیلی وزارت دفاع نے الخلیل (ہیبرون) کی جامع مسجد ابراہیمی کا کنٹرول فلسطینی وقف سے لے کر کیر بات عربہ مذہبی کونسل کو دے دیا۔

1997ء سے اب تک ہیبرون کونسل، اوسلو دوم معاہدوں کے ذریعے سے متعدد اقدامات کیے گئے۔ فلسطینی حکام کو بے اثر کرتے ہوئے اسلامی وقف اور الخلیل (ہیبرون) بلدیہ کو معاملات سے الگ کر دیا۔ اس سے قبل مسجد کے مسلم حصے، سیفٹی کے ڈھانچے، بجلی، سینی ٹیشن اور نگرانی کے عوامل فلسطینی حکام کے پاس تھے۔ اسرائیلی فوج کے پاس صرف سیکیورٹی اور یہودیوں کے داخلے کے امور تھے۔

ان انتظامی اور قانونی امور نے اسرائیلی حکام کو محدود کر رکھا تھا۔ ان کو مینجمنٹ کے ڈھانچے یا فلسطینیوں کی منشاء کے بناء کسی تبدیلی کا اختیار نہیں تھا۔ اب انہیں مکمل اختیار دے دیا گیا ہے۔ اب اسرائیلی فوج کو بھی مکمل اختیار دے دیا گیا ہے۔ گویا قبضہ مستحکم کر لیا گیا ہے۔

اس تبدیلی نے یک طرفہ تبدیلیوں کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ نئے تعمیراتی منصوبے اور آبادکار یہودیوں کے ذریعے نو آبادیات پھیلنے لگی ہیں۔ یہ بین الاقوامی قانون کو پامال کرنے کا اقدام ہے۔ اس کی مختلف عالمی سطح پر مذمت کی جا رہی ہے۔

آبادکار یہودیوں نے بھاری پولیس فورس کی مدد سے الاقصیٰ مسجد پر بڑا دھاوا بولا۔ ان کی قیادت قومی سلامتی کے انتہائی دائیں بازو کے وزیر اتمار بن غفیر کر رہے تھے۔ انہوں نے مسجد میں یہودی عبادت کی۔

جب سے غزہ میں نسل کشی کی جا رہی ہے، بن غفیر آٹھویں بار مسجد اقصیٰ میں کسی استحقاق کے بناء صرف طاقت کے بل پر گھس آئے۔ جب سے وہ وزیر بنے، مسجد الاقصیٰ پر یہ ان کا گیارہواں حملہ تھا۔ ان میں سے کسی بھی حملے کا عالم اسلام کے کسی بھی کونے سے نوٹس تک نہیں لیا گیا۔ اس سے قبل یہودیوں کو داخلے سے فوج روک دیتی تھی۔ یہودی سیاح مشرقی پلازہ سے آگے بڑھ نہیں سکتے تھے۔ عبادات کرنے کا معاملہ تو بالکل ان کے لیے ممکن ہی

نہیں ہوسکا تھا۔

یہودیوں کی مذہبی اشرافیہ کے اپنے عقائد کے مطابق ان کا مسجد اقصیٰ میں داخلہ درست یا جائز نہیں ہے۔ 1967ء میں اسرائیلی قبضے کے بعد بھی جوں کی توں صورت حال برقرار رکھنا لازمی ہے۔ اس کے مطابق بھی یہودی مسجد میں داخل نہیں ہوسکتے، وہاں کسی نوعیت کی مذہبی عبادات کا حق ہی نہیں رکھتے۔ مسجد کے جملہ معاملات صرف اور صرف اسلامی اوقاف کی ذمہ داری ہے۔ مسجد میں داخلے اور عبادات کا حق صرف اور صرف مسلمانوں کو ہی حاصل ہے۔ ان پر مسجد کے کسی بھی حصہ میں محدود رہ کر عبادت یا نماز ادا کرنے کی پابندی ہرگز نہیں ہے۔

بن غفیر یا کسی بھی اور وزیر کی طرف سے خود یا یہودی سیاحوں کے وفد یا جلوس کا آنا منع ہے۔ بن غفیر نے یہودیوں کے ماتم کے دن Tisha B'Av کے موقع پر اعلان کیا کہ یہ دن محض ماتم کا نہیں ہے بل کہ تیسرے ہیکل کی تعمیر کا دن ہے۔ اس طرح اس نے اس دن کی مناسبت میں خود ہی اضافہ کردیا۔ ہیکل کے پہلے اور دوسرے حصے کی صدیوں پہلے تباہی کے ماتم کی حیثیت سیاسی اعتبار سے ثانوی کردی۔

یہ اعلان وزیراعظم نیتن یاہو کے مہینوں پہلے ایک ویڈیو کے اپنے آفس سے اجراء کے بعد کیا۔ اس ویڈیو میں دکھایا گیا تھا کہ مسجد کے نیچے سرنگوں کی کھدائی سے جو کچھ نظر آیا وہ کئی عشرے پہلے یہ تھا کہ فلسطینی مسلسل خبردار کرتے آئے تھے کہ یہودیوں کے کھدائی کرنے کے اقدامات نے مسجد کی بنیادوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ فلسطینیوں نے مزید خبردار کیا تھا کہ کھدائی کا عمل روکا نہ گیا تو مسجد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

فلسطینی وارننگ نظرانداز:

اس سلسلے میں سب سے زیادہ پریشان کن صورت حال یہ تھی اور اب اس میں مزید اضافہ ہوگیا ہے کہ عرب اور مسلم دنیا میں سے کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے مسجد کے اسلامی اوقاف کے امور کے نگران اردن نے بھی ہر بار وارننگ نظرانداز کردی۔ وقت گزرنے کے ساتھ سردمہری کا یہ رویہ یہودیوں کو مزید شیر بناتا رہا۔ فلسطینی بتاتے رہے کہ مسجد اقصیٰ مزید خطرے میں ہے، اسرائیل کے عزائم مزید تباہ کن ہورہے ہیں۔ ان تمام وارننگز کو بے بنیاد قرار دے کر مسترد کیا جاتا رہا۔

اب المیہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ فلسطینی محض پروپیگنڈہ نہیں کررہے تھے، وہ حقیقی صورت حال بیان کررہے تھے۔ یروشلم گورنریٹ کی طرف سے باقاعدہ سرکاری اعلان جاری کیا گیا ہے:

”آج، مسجد اقصیٰ کی تقسیم خطرناک صورت حال سے دوچار ہے۔ ہم خبردار کرتے ہیں کہ کسی بھی وقت مذہبی جنگ چھڑ سکتی ہے۔“

کئی عشروں سے جاری فلسطینی وارننگ بالآخر درست ثابت ہوئی ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ اسرائیل مسجد اقصیٰ کا سٹیٹس تبدیل کررہا ہے۔ یہ صورت حال اب سارے عالم اسلام کے سامنے ہے۔ اب دیکھا جارہا ہے کہ مسجد کے تہہ خانوں میں اسرائیل نے جو کھدائی کی ہے وہ مسجد کے لیے سنگین مستقبل کی خبر دے رہی ہے۔

ان تمام تر معاملات کے باوجود عالمی سفارتی حلقوں میں مکمل بے اعتنائی پائی جاتی ہے۔ یہ سب اس مفروضے پر کیا گیا ہے کہ اسرائیل کے بارے میں الزامات سراسر پروپیگنڈہ ہیں اور غلط ہیں۔ اس کے باوجود ہر سال نئی تباہی سامنے آتی ہے جس سے مسجد گزرتی ہے۔ صرف ایک بار گزشتہ سال میں یہودی سیاحوں کو مسجد میں داخلے سے پولیس نے روکا ہے ورنہ بن غفیر ہر کچھ عرصہ بعد یہودیوں کو لے کر مسجد میں گھسے ہوتے ہیں۔

غزہ میں ہونے والی نسل کشی سے ثابت ہوا ہے کہ اسرائیل نہ صرف سفاک دشمن ہے بل کہ عالمی کمزور ردعمل نے مزید حوصلہ دے دیا ہے۔ وہ ایسے ظلم بھی کرگزرا ہے جن کا آج کی نام نہاد دنیا میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نسل کشی کے اس عمل میں اس نے ہزاروں واقعات میں سینکڑوں بین الاقوامی قوانین پامال کردیے ہیں۔

امریکہ کے علاوہ کوئی بھی دوسرا ملک وہ کچھ کرگزرے جو اسرائیل کررہا ہے، ایک تصور محال ہے۔ یوکرائن پر روس حملہ آور ہے۔ اسے دنیا اور بالخصوص امریکہ و یورپ کی طرف سے ناقابل بیان پابندیوں کا سامنا ہے۔ یہ اس حقیقت کے باوجود ہے کہ روس کا وجود ان کے لیے بہت اہم ہے۔

مغربی ممالک آج بھی اسرائیل کو مسلسل اسلحہ فراہم کررہے ہیں۔ (حال ہی میں) سعودیہ کا ائیرپورٹ پر ایک کارگو جہاز روکا گیا ہے جس میں اسلحہ تھا جو امریکہ کی طرف سے تل ابیب بھیجا جارہا تھا)۔ عرب حکومتیں اسرائیل سے تعلقات قائم کرنے کے لیے راستے تلاش کررہی ہیں۔ اس کو صرف یوں ہی بیان کیا جاسکتا ہے کہ عرب ممالک غزہ میں اسرائیل کے شدید ظلم و ستم اور نسل کشی پر اسے ایوارڈز عطا کررہے ہیں۔

سچائی اب فلسطینیوں سے مطالبہ کررہی ہے کہ وہ حالات کو سمجھیں۔ جب سے جنگ کے نام پر یہ سب کچھ یکطرفہ نسل کشی کی صورت میں غزہ میں ہورہا ہے، اسرائیل جو کچھ کررہا ہے، وہ صرف یہی ہے کہ اسے کھلا موقع دیا گیا ہے کہ وہ جو کچھ کررہا ہے، بلا روک ٹوک کرتا رہے۔ امریکہ صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ان اقدامات کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ ان کے اس دور صدارت میں غزہ ختم ہوگا۔

یہ خیال درست نہیں ہے کہ اسرائیل غزہ اور پورے فلسطین میں جو کچھ کررہا ہے، وہ اس میں ناکام ہوجائے گا۔ امریکہ کے خصوصی نمائندے سٹیو وٹکاف نے اسرائیل اور غزہ کے دورے کے بعد کہا ہے کہ غزہ میں کسی نوعیت کا قحط نہیں ہے۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ خود امریکی فوج رپورٹ دے رہی ہے کہ فلسطینی اس قحط کی وجہ سے روزانہ ہلاک ہورہے ہیں۔ ان کے مطابق یہ تباہ کن حالات ہیں جن میں اسرائیل نے غزہ کو مبتلا کررکھا ہے۔

غزہ میں جاری نسل کشی اسی صورت میں رک سکتی ہے کہ ساری دنیا ایک زبان ہوکر اسرائیل اور امریکہ پر دباؤ ڈالے ورنہ اسرائیل کے سیاستدانوں کے بیانات کا اشتعال بڑھتا جارہا ہے۔ یہی حال مسجد الاقصیٰ کے مستقبل کا ہے۔

امریکہ کے نمائندے وٹکاف کو غزہ فاؤنڈیشن کے کردار میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ یہ کردار نسل کشی کا ہے۔

زمین پر ہونے والے واقعات سے ظاہر ہورہا ہے کہ فاؤنڈیشن اور امریکہ کا کردار فلسطینیوں کے قاتل کا ہے۔ فلسطین کے لوگ اکیلے ہیں۔ ان کو مارنے کے لیے امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ پورا مغرب کام کررہے ہیں۔ ان کی مدد نے اسرائیل کو مسلسل نسل کشی کا حوصلہ دیا ہے۔

اب اسرائیل خطے کا جغرافیہ بھی تبدیل کرنے کی راہ پر چل نکلا ہے۔ یہی کچھ مسجد الاقصیٰ کے مستقبل کے ساتھ ہونے جارہا ہے۔ عربوں یا مسلمانوں کو اس کی چنداں فکر نہیں رہی ہے۔

یہ دراصل نظر آرہا ہے کہ اسرائیل اپنے مقاصد مکمل حاصل نہیں کرسکا ہے۔ وہ اس کی قیمت اپنے فوجیوں اور معاشرتی عدم استحکام کی صورت میں ادا کررہا ہے۔ تاریخ میں دنیا بھر سے پہلی مرتبہ اس نے نفرت ہی سمیٹی ہے۔

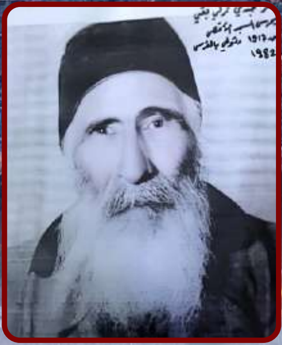

خصوصی رپورٹ: آصف محمود

آخری پہریدار

یروشلم میں رات ایسے اتری جیسے پرسہ دینے آئی ہو

عثمانی فوج کو سلطان کا حکم موصول ہوا: شہر خالی کر دو، معاہدے کے مطابق کچھ عثمانی فوجی ابھی یروشلم میں ہی رہنے تھے تا کہ شہر اچانک اجنبیوں کو دیکھ کر مضطرب نہ ہو جائے۔ کمانڈر مصطفی نے پیچھے رہ جانے والوں کو ذمہ داریاں سونپیں، ان کی فہرست برطانوی ہم منصب کو بھیجی اور اپنے دستوں کو لے کر شہر سے نکل گیا۔ یخ بستہ رات کے سناٹے میں، رخصت ہونے والوں کے قدموں کی چاپ دھیرے دھیرے تحلیل ہوتی گئی۔

جبل زیتون پر پہنچ کر کماندار مصطفی اچانک رک گیا۔ جیسے دل میں کوئی تیر آ لگا ہو۔ اس نے اپنے محافظ کو آواز دی: ''حسن۔'' نوجوان دوڑا چلا آیا۔

''میرے بیٹے، میں تمہیں ایک امانت سونپنا چاہتا ہوں کمانڈر کے لہجے میں تمکنت سے زیادہ درد اور اداسی تھی۔'' حکم کریں پاشا۔

''تم فی الحال یہیں رکو۔ مسجد اقصی کو میں تمہاری حفاظت میں دے رہا ہوں۔ حرم میں ہی رہنا اور کوئی غفلت نہ کرنا'' مصطفی نے اپنا خنجر اس کی طرف بڑھا دیا، حسن نے دونوں ہاتھوں سے خنجر تھاما، اس پر کندہ خلافت کو طغرے کو بوسہ دیتے ہوئے کمر میں اڑس لیا۔

شہر میں جنرل ایلن بے کا لشکر اترا، ہر طرف اداسی پھیل گئی۔ وہ مگر حدود حرم سے باہر نہیں نکلا، وہ اپنی ڈیوٹی پر موجود رہا۔ حالات معمول پر آنے لگے تو پیچھے رہ جانے والے ترک دستے بھی استنبول روانہ ہو گئے لیکن سپاہی وہیں رہا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا، انتداب آیا، ختم ہو گیا، اسرائیل قائم ہو گیا، بغاوت ہوئی، لڑائی ہوئی، عرب اسرائیل جنگیں ہوئیں، لیکن سپاہی اپنی جگہ پر رہا۔

اس کی جوانی ڈھلی، اس کے بالوں میں سفیدی آنے لگ گئی، چہرے میں جھریاں اتر آئیں، بینائی متاثر ہونے لگی، اس کے ہاتھوں میں رعشہ آ گیا، لیکن سپاہی نے مورچہ نہیں چھوڑا۔

وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ خاموش رہتا، اس کے کپڑے پھٹ گئے، پھر ان پر پیوند لگنے لگے، پھر پیوند بڑھتے گئے، حتی کہ چیتھڑے بن گئے، لیکن اس کا پیرہن وہی رہا۔ لوگوں نے اسے مجذوب سمجھنا شروع کر دیا۔

ایک عید پر ہند الحسینی نے اس کے لیے کپڑوں کا قیمتی جوڑا بھیجا۔ امام مسجد نے اصرار کیا اور سپاہی نے نئے کپڑے پہن لیے۔ عید کی ادائیگی کے تھوڑی دیر امام مسجد نے دیکھا سپاہی پھر انہی چیتھڑوں میں ملبوس تھا۔ انہوں نے محبت سے ڈانٹا، تمہارے نئے کپڑے کہاں ہیں، وہ کیوں اتار دیے۔ سپاہی بولا: اب میں ڈیوٹی پر ہوں۔ امام مسجد یہ سوچ کر آگے بڑھ گئے کہ مجذوب ہے۔

دن، مہینے، سال، عشرے گزرتے گئے۔ 1980 کا جاڑا آ گیا۔ سپاہی اب ٹمٹماتا چراغ تھا۔ اس کی عمر اب 84 سال ہو چکی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ، بینائی انتہائی کم، سانس کی تکلیف، اس سب کے باوجود وہ اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ شہر میں اسرائیل کا قبضہ تھا مگر مسجد کے معاملات المجمع الاسلامی دیکھ رہا تھا۔ وقف کے منتظمین سپاہی کی دیکھ بھال کر دیتے تھے کہ اس نے ساری عمر حرم میں گزار دی اب اس عمر میں کہاں جائے گا۔

ایک دن وہ باب السلسلہ کے پاس بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے جبل زیتون کی وہ رات یاد آ گئی، جو آنسو اس نے 1916 کی اس یخ بستہ روت کو روک لیے تھے، وہ سب آج 64 سال بعد اس کی پلکوں میں اُمڈ آئے۔ اس نے بے اختیار ہو کر کماندار مصطفی کا دیا خنجر نکالا اور اس پر بنے عثمانی طغرے کو چوم کر سینے سے لگا لیا۔ نقاہت، کمزوری اور رعشے کے سبب وہ خنجر سنبھال نہ سکا اور وہ زمین پر گر گیا۔

عین اسی وقت ترک حکومتی وفد وہاں سے گزر رہا تھا جو او آئی سی کے ایک اجلاس میں شرکت کے لیے اردن آیا تھا۔ اس کے سربراہ جلال یلماز کی نظر اس خنجر پر بنے طغرے پر پڑی اور وہ وہیں رک گیا۔ جلال یلماز سلیمان ڈیمیرل کا قریبی آدمی تھا اور سیکولر ہونے کے باوجود روایت پسند شخص تھا۔ طغرے پر نظر پڑی تو اس کا تجسس بڑھ گیا۔

یہ بوڑھا کون ہے؟ اس نے اردن کے وقف کے ترجمان سے سوال کیا۔

یہ ایک ترک مجذوب ہے، سالوں سے یہیں ہوتا ہے۔ ترجمان نے جواب دیا۔

''آپ مجھے تھوڑی دیر مجذوب کے پاس اکیلا چھوڑ دیں۔'' جلال یلماز وہیں بیٹھ گیا۔

چھ دہائیوں بعد پہلی بار سپاہی نے اپنی کہانی کسی کو سنائی۔ جلال یلماز پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس نے سپاہی کو سمجھایا کہ دیکھو جنگ بھی ختم ہو گئی ہے اور سلطنت بھی ختم ہو چکی ہے، اب کوئی خلیفہ بھی موجود نہیں، اسرائیل کو اب ترکی تسلیم کر چکا ہے، تم بھی 84 سال کے ہو چکے ہو چلو میرے ساتھ واپس اناطولیہ چلو۔

سپاہی مگر بضد تھا کہ کماندار یا خلیفہ کے حکم کے بغیر ڈیوٹی سے واپس نہیں جائے گا۔ وفد کے کچھ لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر سپاہی نے ہونٹوں پر انگلی رکھی: ششش خاموش، یہاں کسی کو کچھ نہ بتانا، میں ڈیوٹی پر ہوں۔

جلال یلماز نے سپاہی کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وفد کے لوگوں نے سمجھا جلال یلماز کو مجذوب سے عقیدت ہو گئی ہے۔

یلماز نے جاتے جاتے وقفف کے منتظمین کو سب بتا دیا مگر اس شرط پر کہ سپاہی کو معلوم نہ ہو اس کا راز فاش ہو چکا ہے۔

چند ماہ بعد ایک صبح موذن فجر کی اذان دینے کے لیے گیا تو اس نے دیکھا سپاہی سجدے میں ہے اور سجدہ طویل ہو چکا ہے۔ سپاہی کی ڈیوٹی مکمل ہو چکی تھی۔

نماز فجر کے بعد امام مسجد نے سپاہی کا راز نمازیوں کے سامنے فاش کر دیا۔ ظہر کے بعد سپاہی کا جنازہ اٹھا تو اسرائیلی انتظامیہ بھی حیران تھی کہ اتنے لوگ کیوں اُمڈ آئے ہیں۔

باب المغاربہ کے قریب سپاہی کو اس کے خنجر سمیت دفن کر دیا گیا۔ قبر پر کسی نے کتبہ لگا دیا: ایک اجنبی کے نام جو اپنے گھر میں انتقال کر گیا۔ کچھ وقت یہ کتبہ موجود رہا پھر مٹ گیا، پھر قبر کے نشان بھی معدوم ہو گئے۔

اقصی کی مٹی مگر جانتی ہے کہ اس میں ایک محافظ دفن ہے۔

(سالوں بعد دکھوں کے ہجرتی غزہ میں جمع ہوئے تو انہوں نے تل الھوی میں اس سپاہی کے نام پر مسجد حسن تعمیر کی۔ یہ مسجد حسن بھی اب کارپورل حسن کی طرح شہید ہو چکی ہے)۔

غزہ پر قبضہ کریں گے، اسرائیل: مثالی مزاحمت ہوگی، حماس

اسرائیل کی جنگی کابینہ نے غزہ پر فوجی قبضے کا اعلان کیا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ آپریشن آغاز میں غزہ سٹی فتح کرے گا۔ اس ابتدائی عمل میں سٹی کو اس کی ساری فلسطینی آبادی سے خالی کرایا جائے گا۔

سرکاری بیان میں ''قبضہ کرنے'' کے الفاظ کے بجائے ''ٹیک اوور'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ''قبضہ کرنے'' کے الفاظ اس لیے استعمال نہیں کیے گئے کیوں کہ کابینہ کی رائے یہ تھی کہ ایسا کرنے کے قانونی اور سیاسی اثرات زیادہ ہوں گے۔ یہ بات اسرائیل کے وائے نیٹ نیوز کے حوالے سے کہی گئی ہے۔ اس میڈیا ذریعہ کو اعلیٰ سرکاری حکام میں سے ایک نے بتایا ہے کہ الفاظ کا چناؤ صرف سرکاری مؤقف کو بیان کرنے کے لیے کیا گیا ہے ورنہ اس سے مراد یہی ہے کہ غزہ پر مکمل فوجی قبضہ کیا جائے گا جس میں غزہ سٹی کی دس لاکھ آبادی کو بے دخل کر دیا جائے گا۔

اسرائیلی وزیر اعظم بنیامین نیتن یاہو کے آفس کے حوالے سے ٹائمز آف اسرائیل نے رپورٹ کیا ہے کہ فوج اس شہری آبادی میں ''انسانی بنیادوں پر'' خوراک تقسیم کرے گی جو جنگ کے زون سے پرے رہیں گے۔

آفس نے پانچ نکاتی منصوبہ جاری کیا ہے۔ اس منصوبے کو ''جنگ ختم کرنے کے اصول'' قرار دیا گیا ہے، ان میں:

- حماس کا مکمل خاتمہ
- یرغمالیوں کی مکمل واپسی
- غزہ کو غیر فوجی بنانا
- غزہ پر اسرائیل کا مکمل کنٹرول

غزہ میں سول انتظامیہ کا ایسا قیام جو حماس اور فلسطینی اتھارٹی میں سے نہ ہو۔

اسرائیل کے حکام نے Axois کو بتایا ہے کہ پہلے مرحلے میں غزہ سٹی کو اس کی سول آبادی سے خالی کرایا جائے گا۔ اس وقت یہ آبادی دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ کام دو مہینوں میں مکمل کیا جائے گا۔ اس کے بعد شہر کا مکمل محاصرہ کیا جائے گا۔ اگلے مرحلے میں حماس کے ارکان کو نشانہ بنایا جائے گا۔ اس کے بعد زمینی آپریشن کا آغاز کیا جائے گا۔ اس منصوبے کے بارے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ اس کو کب شروع کیا جائے گا۔

مواصلاتی خاکوں کی مدد سے این بی سی نیوز نے رپورٹ دی ہے کہ اسرائیلی فوج غزہ کی باؤنڈری پر جمع ہے یا جمع ہو رہی ہے۔ اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ ممکنہ زمینی حملے کی تیاری ہے۔

قبضے کی رپورٹوں پر حماس نے ابتدائی تبصرے میں کہا ہے کہ یہ اقدام ظاہر کرتا ہے کہ نیتن یاہو کو یرغمالیوں کی رہائی کی کوئی فکر نہیں ہے۔ وہ اس کے بجائے اپنے سیاسی مفادات کے

لیے اقدامات کر رہے ہیں۔ وہ کسی جنگ بندی معاہدے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

حماس اور دیگر مزاحمتی گروپوں نے واضح کیا ہے کہ فلسطینی عوام کے خلاف کوئی اقدام کرنے والوں کو علم ہونا چاہیے کہ وہ کسی پارک میں چہل قدمی نہیں کر رہے ہوں گے۔ انہیں مثالی مزاحمت کا سامنا ہوگا۔

ابتدائی ردعمل میں اقوام متحدہ نے اسرائیل سے کہا ہے کہ وہ اپنی کابینہ کے اعلان کو واپس لے۔ یہ بالکل غلط فیصلہ ہے۔ برطانیہ نے بھی اس کو غلط فیصلہ قرار دیا ہے۔ اسرائیل میں امریکی سفیر مائیک حکابی نے اپنے طنزیہ جملوں میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے نیتن یاہو کے لیے عشائیہ میں کہا ہے کہ نازی جرمنی کے خلاف لیڈر شپ برطانوی وزیر اعظم کیئر سٹارمر کے پاس ہوتی تو وہ آسانی سے نازی جرمنی سے ہار چکے ہوتے۔ حکابی نے کہا ہے کہ اسرائیل کو حماس کے سامنے ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔

غزہ کے غیر مسلح، بھوکے پیاسے شہریوں پر اسرائیل کی قابض فوج کے حملوں میں شدت آتی جا رہی ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر اوسطاً پچاس فلسطینیوں کو فائرنگ کر کے شہید اور بیسیوں مزید کو زخمی کیا جا رہا ہے۔ ان میں زیادہ تعداد ان فلسطینیوں کی ہے جو غذائی امداد کے لیے غزہ فاؤنڈیشن کے ڈیتھ ٹریپ کا یہ جانتے ہوئے بھی رخ کرتے ہیں کہ وہاں سے زندہ واپس آنے کا امکان اور آٹے کا ایک تھیلا ملنے کا امکان ففٹی ففٹی ہے۔

فائرنگ کے واقعات سنائپرز کے حملوں کے ساتھ ساتھ قابض فوج کے ڈرونز سے ہونے والے ہلاک و زخمی ہونے والوں کے بھی ہیں۔ غزہ کے علاقے خان یونس کے بنی سہیلہ ریجن میں یہ واقعات زیادہ رونما ہو رہے ہیں۔ ناصر ہسپتال میں لائے جانے والے ہلاک شدگان زیادہ ہیں۔ یہیں زخمی ہونے والوں کو لایا جاتا ہے۔

الجزیرہ عربیک نے رپورٹ کیا ہے کہ شہیدوں کی تعداد میں اضافہ اس لیے بھی ہو رہا ہے کیوں کہ ٹارگٹ بننے والوں کو زیادہ تر سروں میں گولیاں لگتی ہیں۔ دوسرے نمبر پر وہ لوگ ہیں جن کے سینوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ تیسرے وہ فلسطینی ہیں جو زخمی ہونے کے بعد تادیر موقع واردات پر پڑے رہتے ہیں۔ ان کا خون بہت زیادہ بہہ جانے سے وہ جاں بحق ہو جاتے ہیں۔

ان رپورٹوں میں بتایا جا رہا ہے کہ امریکہ اور اسرائیل کے غذائی تقسیم کے ان مراکز میں اسرائیل کے تازہ حملوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اردن ہسپتال کے ذرائع نے بتایا ہے کہ خوراک کے بجائے موت بانٹنے کے ان مراکز پر شہید ہونے والوں کی تعداد 1300 سے زیادہ ہو چکی ہے۔ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اسرائیل کی طرف سے غزہ پر مکمل قبضے کے اعلان کے بعد ان شہادتوں اور زخمیوں میں اضافے کو روکا نہیں جا سکتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شمالی غزہ میں خوراک کی تقسیم کے مراکز اب چار کے بجائے بارہ کرنے کی اطلاعات ہیں۔

الجزیرہ عربیک کی نمائندہ ہدیٰ عبدالحامد کا کہنا ہے کہ قابض فوج نے غزہ پر مکمل قبضے کا کوئی متعین نظام الاوقات جاری نہیں کیا ہے، لیکن ایک بڑا زمینی حملہ کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ اسرائیل کی جنوبی سرحد سے افواج کی نقل و حرکت ابھی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ابتدائی طور پر 9 لاکھ کے قریب فلسطینی غزہ شہر سے ہٹائے جانے کا منصوبہ ہے۔ اس میں کئی ہفتے یا مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ زمین پر موجود مزاحمتی گروہوں سے ٹکراؤ کی کیا صورت سامنے آسکتی ہے۔

فوجی ماہرین نے بتایا ہے کہ اسرائیل کے منصوبے کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ غزہ پر مکمل قبضے کی کیا حکمت عملی اختیار کرے گا، امریکہ کی مدد کی نوعیت کیا ہوگی، مغربی اتحادی اسرائیل کی زبانی مذمت کرتے رہیں گے یا اس سے آگے بڑھ کر اس پر فوجی اور اقتصادی پابندیاں بھی لگائیں گے؟ غزہ میں حماس کے متبادل سول انتظامیہ لگانے کے کام کا کیا ہوگا؟ غرض یہ کہ ابھی بہت سے سوالات جواب طلب ہیں۔

اقوام متحدہ ابھی تک اسرائیل کی مذمت کے سوا کوئی کام کرنے سے یکسر قاصر چلی آ رہی ہے۔ یہی حال یورپی یونین اور اس کے رکن ممالک کا بھی ہے۔ عرب ممالک ان سوالوں پر مکمل چپ سادھے محض خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہ ان کی مجبوری نہیں بل کہ طے شدہ پالیسی ہے جس پر وہ اسرائیلی حملے اور فلسطینیوں کی نسل کشی کے آغاز سے کاربند ہیں۔ ابھی تک امریکہ نے بھی کوئی ایسی بات نہیں کی ہے کہ غزہ پر اسرائیل کے قبضے کے اعلان پر اس کا ردعمل کیا ہے؟

امریکہ کے نائب صدر جے ڈی وینس نے ان سوالوں پر کچھ کہنے سے انکار کر دیا ہے کہ امریکہ اسرائیل کے منصوبوں پر کیا پالیسی اختیار کرے گا۔ ان کی جانب سے ہر بات پر یہی کہا جا رہا ہے کہ وہ فلسطینی ریاست کی حمایت کرتے ہیں اور یہ کہ حماس کو نہتے لوگوں پر حملے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ بیانات دراصل اسرائیل کا مؤقف پیش کرتے ہیں۔ یہ دعویٰ اسرائیل کا ہے کہ حماس نے 7 اکتوبر 2023ء کو نہتے اسرائیلی شہریوں پر حملہ کیا تھا۔ اس کا اب تک اسرائیل بھی کوئی مصدقہ ثبوت نہیں دے سکا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ اسرائیل کے لیے فوجی اعتبار سے ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا ہے کہ وہ غزہ کا فوجی قبضہ لے سکے۔ اس سلسلے میں ان کی کسی نوعیت کی پیش قدمی یا اقدام بھی سامنے نہیں آسکا ہے۔ اس کام کے کرنے کے لیے اسے امریکہ سے اربوں ڈالر کی امداد درکار ہوگی۔

ڈونلڈ ٹرمپ نے کئی بیانات میں غزہ میں ”کلین اپ“ آپریشن کا ذکر کیا ہے۔ امریکہ کے بھی کسی اقدام میں اس سمت میں کسی کارروائی کا کوئی خاکہ بھی سامنے نہیں لایا گیا ہے۔ اس طرح غزہ کو مشرق وسطیٰ کی ساحلی تفریح گاہ بنانے کا پروگرام بیانات کی حد تک ہے۔

حماس نے اسرائیل کے غزہ پر قبضے کے مجوزہ منصوبے کو ”جنگی جرم“ قرار دیا ہے۔ حماس نے کہا ہے کہ اس منصوبے کے اعلان کے بعد دنیا کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ اسرائیل جنگ بندی کے مذاکرات سے راہ فرار کیوں اختیار کرتا رہا ہے۔ حماس کے ردعمل کو ایک ٹیلی گرام پیغام سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ اس پیغام میں بڑے واضح طور پر کہا گیا ہے کہ فلسطینی ایسے کسی بھی منصوبے کی زبردست مزاحمت کریں گے۔ وہ کسی قبضے یا اس کے لیے ہونے والی جارحیت قبول نہیں کریں گے۔ اس پیغام میں امریکی رویے کو اشتعال انگیزی قرار دیا گیا ہے جس سے اسرائیل کے جنگی جرائم کی بڑھتی فہرست کا ساتھ دینے کا پتہ چلتا ہے۔ بین الاقوامی کمزور ردعمل کو فلسطینی عوام کے خلاف ایک اور جرم قرار دیا گیا ہے۔

اسرائیل کا تازہ اعلان فلسطینیوں کو بے دریغ قتل کرنے کے پہلے مرحلے کے اقدام کی مکمل شکست کا عملی طور پر اعتراف ہے۔ اس مرحلے میں سارے غزہ کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا۔ اس کے باوجود یہ دعویٰ آج تک برقرار ہے کہ حماس کو شکست دینی ہے۔ امریکہ بھی یہی کہتا رہا کہ وہ حماس کو دہشت گرد سمجھتا ہے، چناں چہ اسے شکست دینا ضروری ہے۔ اب قابض اسرائیل کی کابینہ کے غزہ پر قبضے کے اعلان میں بھی یہی دعویٰ ہے اور وہ اب تک دم سادھے تماشا دیکھ رہا ہے۔

اس شکست کا تقاضا یہی ہے کہ کسی بھی ملک یا قوم پر دہشت گرد قرار دینے کی روش ترک کر دی جائے۔ یہ ایک گھسا پٹا نعرہ ہے۔ بیس سال طالبان کو دہشت گرد قرار دینے کے بعد وہاں سے اپنی نا آسودہ خواہش کے ساتھ اسے نکلنا پڑا تھا۔ اسرائیل بھی اسی راستے پر ہے۔

خصوصی رپورٹ: ابوالعین

فلسطینی ریاست: مغرب کا پروپیگنڈہ؟

فلسطینی ریاست تسلیم کرنا پہلی نظر میں ایک اخلاقی مسئلہ محسوس ہوتا ہے، وہ بھی مغربی شعور کو بیدار کرنے کی علامت یا غزہ کی تباہی سے برآمد ہونے والا تصور ہے۔

اس سلسلے میں فرانس نے مسابقت کی اور اس نے اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت سعودی عرب کے ساتھ مل کر ایک بین الاقوامی کانفرنس کر ڈالی۔ اس قدم پر برطانیہ کے وزیر اعظم کیئر سٹارمر نے قدم رکھا۔ انہوں نے اس ریاست کی مشروط مسلمہ حیثیت کو مانا۔ برطانیہ وہی ملک ہے جس نے بالفور ڈیکلریشن کی صورت میں صہیونیت کے لیے راستہ کھولا کہ وہ فلسطین کو نوآبادیات بنائے اور خود اس ظلم کی اولین سرپرستی کی۔ اب اس کے وزیر خارجہ ڈیوڈ لیمی نے فلسطین کی ریاست مشروط تسلیم کرنے کی بات کی۔

اس معاملے کی تہہ میں جائیں تو یہ اعلانات محض ظاہری، سطحی، علامتی یا بناوٹی ہیں۔ یہ محض ایک سفارتی چابک دستی یا چالاکی کے سوا کچھ نہیں۔

جس امر کا یہ ممالک اعلان کر رہے ہیں، وہ کسی واقعی ریاست کا قیام نہیں ہے۔ اس سے مراد کسی ایسی ریاست کا قیام ہرگز نہیں ہے جس کی باقاعدہ سرحدیں متعین کی گئی ہوں، فضائی حدود ہوں، اس کے اپنے وسائل ہوں۔ یہ محض عسکریت سے آزاد کرایا گیا، غیر حقیقی اور علامتی وجود ہوگا۔ یہ اسرائیل کی نگرانی میں قائم گھوسٹ انتظامیہ کے زیر اثر علاقہ ہوگا جو تباہ حال، منتشر، مقبوضہ آبادی کا تصور ہوگا۔ حقیقی انتظام اسرائیل کے پاس ہوگا۔ اوسلو معاہدوں سے وجود پانے والی بلدیاتی نظام کی حامل فلسطینی اتھارٹی سے بھی کم درجے کی ریاست ہوگی۔ اسے دنیا کی نظروں میں شان دار ریاست کے طور پر متعارف کرایا جائے گا۔

جو کچھ ریاست کے نام پر تسلیم کیا جا رہا ہے، وہ ریاست ہی نہیں ہے۔ اس کے باوجود مغربی راہ نما اسے جرأت مندانہ اور روشن خیال اقدام قرار دے رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا فلسطینی حقوق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایک سیاسی دھوکہ ہے۔ یہ بہت بے ہودہ تضاد ہے۔

فرانس یہ سمجھتا ہے کہ عرب اور مسلم دنیا تک فلسطین ایک سفارتی پل ہے۔ موجودہ صدر ایمائل میکرون کا یہ نظریہ ہے۔ وہ خود کو نئے دور کے چارلس ڈیگال قرار دلوانا چاہتے ہیں۔ وہ اسرائیل کے ایٹمی عزائم کو شکل دینے والے فرانس کے صدر ہیں۔

غزہ، لبنان اور یمن نے عرب اتحاد کے تابوت میں دراڑیں واضح کر دی ہیں۔ سعودی عرب اسرائیل کو تسلیم کرنے کے مراحل میں فلسطینی ریاست تسلیم کرنے کے اقدام کو ''پیش بندی'' تصور کرتا ہے۔ اس کے حکمران یہ تاثر دے رہے ہیں کہ وہ جدید ترقی کے علمبردار ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عرب اور مسلم دنیا کو ابراہام معاہدوں کے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں۔

سٹارمر کے عزائم فوری نوعیت کے ہیں۔ برطانیہ میں عوامی غم و غصہ اسرائیل کی مسلسل حمایت کے خلاف تیز تر ہو رہا ہے۔ برطانوی عوام اسرائیلی جارحیت کے خلاف سڑکوں پر آ رہے ہیں۔ ایسے میں بائیں بازو کے راہ نما جیریمی کاربن سیاسی خطرہ بن رہے ہیں۔ دوسرا بڑا خطرہ زہرہ سلطانہ ہیں۔ یہ دونوں ایک نئی سیاسی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں۔ کیئر سٹارمر فلسطینی ریاست کا نعرہ لگا کر ان دونوں کو بے اثر کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ان کی فلسطینی کاز سے کوئی وابستگی نہیں ہے۔ یہ ایک ہتھکنڈہ ہے۔ برطانیہ کے وزیر اعظم یہ اعلان بھی مشروط کر رہے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ اسرائیل کو امن کے راستے پر لانے کے

لیے دباؤ ڈالا جائے۔ اگر اسرائیل تعاون کرتا ہے تو فلسطینی ریاست تسلیم کرنے کی فائل داخل دفتر کر دی جائے گی۔ یہ کوئی ایسا حق نہیں جس کی توثیق کی جائے۔ گویا یہ ایک بے ہودہ تضاد ہے۔ اگر سٹارمر واقعی دو ریاستی فارمولے کے حق میں ہیں تو دوسری ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان کریں، وہ ایک منطقی نتیجہ ہوگا۔ لیکن مغرب میں کسی بھی ایسے اقدام کو تل ابیب کی منظوری لینا ہوگی۔

اور اس پر بھی تضاد ہے کہ ان کھوکھلے اقدامات کے بارے میں بھی اسرائیل کی انتہائی دائیں بازو کی حکومت بہت بے چین ہے۔ اسرائیل کے وزیر خارجہ یس رائیل کاتس نے کہا ہے کہ ایسی فلسطینی ریاست لندن یا پیرس میں ہی بن سکتی ہے۔ امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کینیڈا کو دھمکی دی ہے کہ اس نے ایسی ریاست تسلیم کرنے کے بارے میں سوچا بھی تو اس پر تجارتی پابندیاں لگا دی جائیں گی۔

لیکن مستقبل کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس کے اندر بھی ایک گہرا سچ پنہاں ہے۔ یہ اقدام بڑا اقدام ثابت ہوگا۔ یہ بین الاقوامی شعور کو جگانے کا کام دے گا۔

اس دوران میں غزہ کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ اس کے وسیع علاقے چٹیل میدان بنا دیے گئے ہیں۔ ہسپتال، سکول، گھر سب کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا گیا ہے۔ اسرائیلی وزیر کھلے عام کہہ رہے ہیں:

''سارا غزہ یہودی ہوگا۔ ہم اس کی آبادی کے لیے زندگی موت سے زیادہ اذیت ناک بنا دیں گے۔''

یہ محض بدمعاش نوعیت کے انتہا پسند نہیں ہیں۔ یہ وہاں کے وزرائے مملکت ہیں، سرکاری پالیسی بنانے والے ہیں۔ اب وہاں کے یہودی آبادکاروں کی تعداد 1993ء سے 2023ء کے درمیان اڑھائی لاکھ سے بڑھ کر 7 لاکھ ہو گئی ہے۔ اوسلو معاہدوں کے تحت ان میں اضافہ بالکل روک دیا جانا تھا۔ ایک ایسی ریاست، جو کاغذوں پر موجود ہو، اس کی منظوری بھی اس پر قابض (اسرائیل) دے گا۔ یہ تو کوئی ریاست نہ ہوئی۔

جگہ جگہ چیک پوسٹ، ہر پہاڑی پر چیک پوائنٹ، ایک قابل عمل فلسطینی ریاست ناممکن، بالخصوص جب سب کچھ محض اور محض سفارت کاری ہو۔ عملی کچھ بھی نہ ہو۔ یہ پالیسی کی ناکامی نہیں ہے۔ یہی تو پالیسی ہے۔

اس پالیسی کا آغاز 1991ء میں میڈرڈ سے ہوا تھا۔ اسے 1993ء میں اوسلو میں حتمی شکل دی گئی۔ اس نام نہاد عمل کو ''امن کا عمل'' قرار دیا گیا۔ لامتناہی بات چیت کا سلسلہ دراز ہوا جن کا کوئی اختتام ہی نہ تھا۔ انصاف بہت ہی تاخیر کا شکار ہو گیا تھا۔

تنظیم آزادیٔ فلسطین (PLO) نے دباؤ میں اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے اس کے بدلے فلسطین کے 78 فیصد علاقے سے اپنی دستبرداری تسلیم کر لی تھی۔ اس نے بقیہ 22 فیصد علاقے پر بھی مذاکرات تسلیم کر لیے تھے۔ مقبوضہ بیت المقدس، مغربی کنارے اور غزہ پر مذاکرات مان لیے تھے۔

اس کے بدلے میں پی ایل او سے ریاست کا وعدہ کر لیا گیا تھا۔ لیکن اہم امور پر کوئی بات سرے سے کی ہی نہیں گئی۔ مہاجرین کا مسئلہ، بیت المقدس، یہودی بستیاں، سرحدیں، ان اہم امور پر مذاکرات غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیے گئے یعنی ٹال دیے گئے تھے۔ اس دوران میں اسرائیل اپنے کنٹرول میں اضافہ کرتا گیا۔

یہودی بستیوں کی بھرمار:

نسل پرستی یہودیت کی نَس نَس میں سمائی ہے۔ نسل پرست انتظامیہ بھی بہترین تشکیل دی گئی تھی۔ مغربی کنارے کو اس طرح سے ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا تاکہ ایک دوسرے سے یکسر جدا علاقے (Cantons) بنائے گئے۔ پہلے اٹھارہ سال غزہ کی مکمل ناکہ بندی کی گئی، جب اس اٹھارہ سال سے زیادہ طویل محاصرے نے اہل غزہ کو ہر طرح سے مفلوج کر دیا تو ان پر کارپٹ بمباری کی گئی۔ اوسلو سے جنم لینے والی فلسطینی اتھارٹی اسرائیلی دفاع میں ڈیلی کنٹریکٹر بن گئی۔ اسے یہ ٹاسک دیا گیا کہ جہاں احتجاج کے جراثیم محسوس کرے، اسے تباہ کر دے اور اپنے ہی فلسطینیوں پر پولیس بن کے نازل ہوتے رہے۔ وہ شاہ سے زیادہ شاہ کی وفادار نکلی۔

آزادی مانگنے گئے تھے، ان کا مزید شدید محاصرہ شروع کر دیا گیا۔ یہ تو امن کا عمل نہیں تھا۔ وہ خودمختار کیا ہوتے، ان کی نگرانی بھی ہونے لگی۔ یہ امن نہیں تھا۔ خاموش کرانے کا سلسلہ تھا۔ لیکن وقت گزرتے گزرتے جدوجہد گہری ہوتی گئی، اس میں شدت آتی گئی، خواہ یہ انتفاضہ کا پہلا دور تھا۔ پھر دوسری انتفاضہ اور پھر غزہ پر عالمی غم و غصہ بڑھتا گیا۔ پھر وہی کام شروع کر دیا گیا۔ پھر مذاکرات، پھر ''دو ریاستی حل''۔ یہ مسئلہ سلجھانے کا راستہ نہیں، الجھانے کا ہے۔ پھر خالی سفارت کاری، پھر بات چیت اور بس۔

غزہ کو بنائے ہوئے انسان کے مسلط کردہ قحط کا سامنا ہے۔ اس قحط کا نفاذ کرنے والا اسرائیل، کرانے والے امریکا، برطانیہ، فرانس، جرمنی، سعودیہ، امارات، قطر اور پھر مجموعی عرب و عجم۔ یہ کہنے کو نقصان روکنے کی حکمت عملی اور عملی طور پر انسانوں کو بھوک، پیاس، گرمی اور بے گھر کیفیت میں مبتلا کر کے مارنے کی حکمت عملی۔

ورچول سٹیٹ:

مغرب زبان سے بہت کچھ کہہ رہا ہے۔ عملی طور پر وہ غزہ کو ورچول سٹیٹ میں تبدیل کرنے میں اسرائیل کو مدد دے رہا ہے۔

فرانس، برطانیہ اور جرمنی اسرائیل کو مسلسل اسلحہ دے رہے ہیں، سیاسی حمایت پر آہنی پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ''اپنے وجود کو بچانا اسرائیل کا حق ہے۔'' یہ نعرہ امریکہ و مغرب سب لگا رہے ہیں۔ ''زندہ رہنا فلسطین کا حق ہے۔'' اسے آگ لگا دی گئی۔ اگر دنیا کو یہ فکر ہے کہ فلسطین کو بچانا ہے تو ممالک اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اعلان واپس لیں۔

اس کے برعکس:

- بنیادی طور پر کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا۔
- اسلحہ کی فراہمی جاری ہے۔
- اسرائیل کو فنڈز مل رہے ہیں۔
- جھوٹ کا تسلسل جاری ہے۔

دوسری طرف:

- فلسطینی خون بہہ رہا ہے۔
- غزہ کی ناکہ بندی جاری ہے۔
- عرب ممالک کی خاموشی برقرار ہے۔

اگر مغرب کو واقعی فلسطینی ریاست کی فکر ہے تو پہلا قدم یہ ہے کہ وہ اسرائیل کی مالی، سیاسی، سفارتی سپورٹ بند کرے۔

فلسطین تسلیم کرنے کا اعلان کرنا ہے تو غزہ کا محاصرہ ختم کرایا جائے۔ بھوک و افلاس کا سلسلہ روکا جائے۔

میکرون اور سٹارمر فلسطینی ریاست کی بات کرتے ہیں جب کہ وہ فلسطین کے، غزہ اور مغربی کنارے کو گراؤنڈ زیرو میں تبدیل کرنے کی پالیسی ختم نہیں کراتے۔ ان کا فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنا بے معنی ہے، صرف اپنے عوام کو دھوکہ دینے کی پالیسی ہے۔ وہ قبضے کو گہرا کر رہے ہیں۔

اگر مغرب غزہ کی نسل کشی نہیں رکواتا، اس کے بیانات اور اعلانات بے فائدہ ہیں۔

پسِ آئینہ: لمیس تغرید

امریکی شخصیات: مغربی کنارے کی یہودی بستیوں میں

امریکی ایوان نمائندگان اور ارکان سینیٹ کی ایک اضافی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان کا دماغ امریکہ اور دل اسرائیل میں ہوتا ہے۔ ان کی تربیت اور اسرائیل کے لیے سہولت کاری کے لیے بیک وقت کئی ایک یہودی تنظیمیں اور آرگنائزیشن سرگرم رہتی ہیں۔ یہ سب ارکان یہودی نہ بھی ہوں، صہیونیت کے لیے ان میں لابنگ ہوتی ہے، اسرائیل حمایت کا لٹریچر تیار ہوتا ہے، بلز اور قراردادیں ڈرافٹ کی جاتی ہیں۔ ان کو ایک پروگرام اور ایجنڈے کے مطابق اسرائیل اور مقبوضہ عرب علاقوں کے دورے کرائے جاتے ہیں، خصوصی ملاقاتیں، کانفرنسز اور سیمینارز میں شرکت کرائی جاتی ہے۔ جب بھی کوئی امریکی عہدے دار اسرائیل کے دورے پر جاتا ہے تو اس کی شخصیت، کام اور کردار کے مطابق لابی کرنے والے ادارے متحرک ہو جاتے ہیں۔

مائیک جانسن تعلیم اور پروفیشن کے اعتبار سے بنیادی طور پر امریکہ کے ٹاپ وکلاء اور قانون دانوں میں سے ہیں۔ مذہبی اعتبار سے قدامت پرست مسیحی ہیں۔ یاد رہے کہ 1995ء میں بوسنیا میں انہی قدامت پرست مسیحیوں نے بوسنیائی مسلمانوں کا قتل عام بے دردی اور بے دریغ کیا تھا۔

مائیک جانسن اس وقت امریکی ایوان نمائندگان کے رکن اور سپیکر ہیں۔ وہ ری پبلکن ہیں۔ انہوں نے جولائی کے آخر اور اگست کے ابتدائی چند دنوں میں اسرائیل کا دورہ کیا ہے۔ یہ ان کے دورے کی اہمیت نہیں ہے۔ وہ خصوصی طور پر مغربی کنارے گئے، وہاں بھی انہوں نے یہودی نو آبادیات یعنی یہودی آبادکار بستی کا دورہ کیا ہے۔ اس وجہ سے فلسطینیوں نے ان کے اس دورے کو شدید ہدف تنقید بنایا ہے۔

انہوں نے ان کے دورے کو بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی قرار دیا ہے۔ اس بارے میں فلسطینی وزارت خارجہ کے ترجمان نے ایک بیان بھی جاری کیا ہے۔

مائیک جانسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے بعد امریکہ کے صدارتی امیدوار بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ نائب صدر بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ان کی ذہن سازی اور مستقبل کے لیے ان کی تیاری کا پروگرام رکھا گیا اور انہیں اسرائیل کے سرکاری دورے کرائے جا رہے ہیں۔ انہیں دوروں میں مغربی کنارے میں قائم یہودی بستیوں کا دورہ بھی کرایا گیا۔

اس وقت مغربی کنارے میں ان یہودی آبادکاروں (Settlers) کا فلسطینی عوام پر

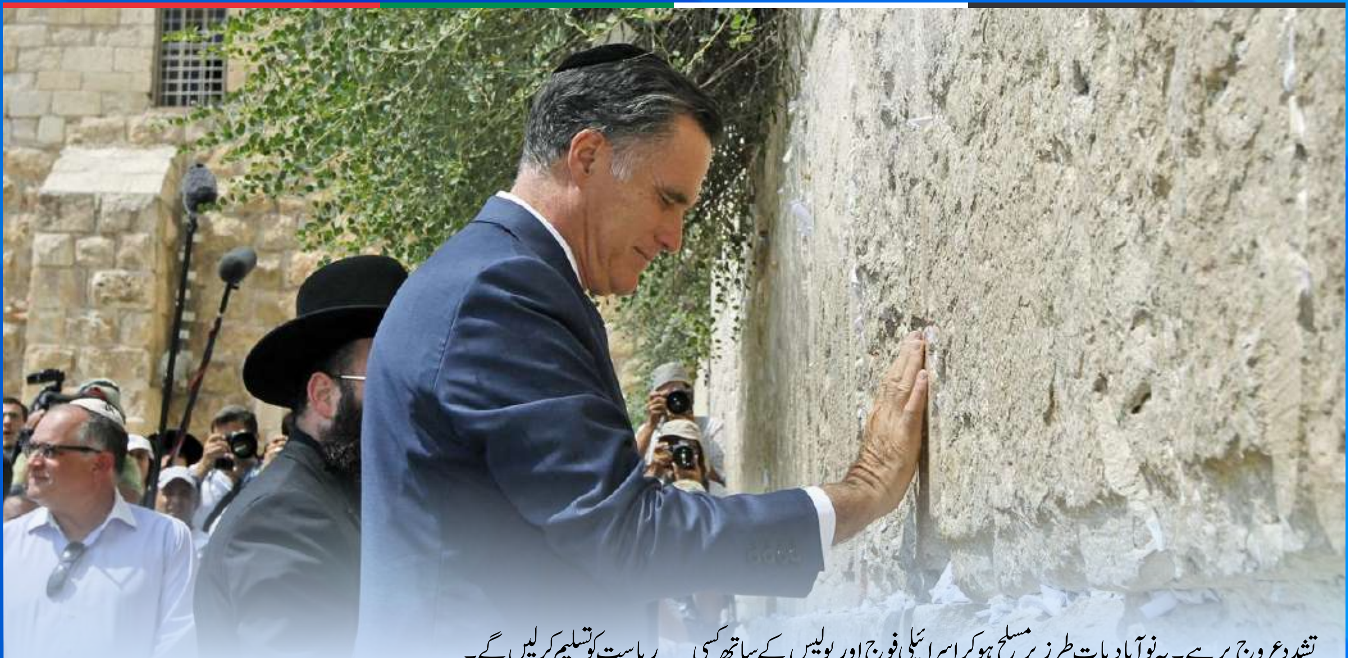

تشدد عروج پر ہے۔ یہ نوآبادیات طرز پر مسلح ہو کر اسرائیلی فوج اور پولیس کے ساتھ کسی جگہ پر اچانک حملہ کرتے ہیں۔ فلسطینی گھر خالی کراتے ہیں، زرعی زمین پر قبضہ کرتے ہیں، مزاحمت کا سامنا ہو تو فلسطینیوں کو قتل تک کرتے ہیں۔ اس دوران میں قابض پولیس اور فوج ان کی کارروائی کا نظارہ بھی کرتی ہے اور تشدد کرنے والے یہودیوں کی مدد بھی کرتی ہے۔

اس پرتشدد ماحول میں امریکی نمائندگان کے سپیکر مائیک جانسن کا دورہ غیر معمولی ہو جاتا ہے۔ اس پرتشدد فضا میں جولائی میں دوران مزاحمت دو امریکی مارے گئے تھے۔ اسرائیلی پولیس کے چھاپے شدت اختیار کر گئے ہیں۔ فلسطینی گھروں کو مسمار کیا جا رہا ہے اور ان کی زرعی زمین پر تیار فصلوں کو آگ لگائی جا رہی ہے۔ فلسطینیوں کو مغربی کنارے سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل ویسا ہی کام ہے جس طرح سے غزہ سے فلسطینیوں کو بے دخل کرنے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

مائیک جانسن کا دورہ ان کوششوں کے بھی متضاد ہے جن کے بارے میں کہا جا رہا تھا کہ مغربی کنارے میں تشدد کی حالیہ لہر کو ختم کیا جائے اور اس تاثر کا خاتمہ ہو سکے کہ اسرائیل کی ان سب کوششوں کی پشت پر امریکہ کھڑا نظر آتا ہے جن میں یہودی نوآبادیات (Settlements) کے کرتا دھرتا موجود ہوتے ہیں۔ فلسطینی ذرائع کا مؤقف ہے کہ یہودی بستیوں میں توسیع اور اضافہ کی ان سرگرمیوں سے بعض ممالک کے دو ریاستی فارمولے کی نفی ہو رہی ہے۔

اسرائیلی میڈیا رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایوان نمائندگان کے سپیکر نے ایریل (Ariel) نامی یہودی بستی کا دورہ کیا۔ یہ بستی رام اللہ کے شمال میں بنائی گئی تھی۔

جانسن نے اس دورے میں متنازعہ بات کی اور یروشلم پوسٹ نے اسے رپورٹ بھی کیا۔ جانسن نے کہا: ''جودیہ اور سمادیہ اسرائیل کی اگلی نسلوں کا اٹوٹ انگ ہیں اور ان کو ایسے ہی رہنا چاہیے۔''

جانسن نے کہا کہ ''دنیا اس سے مختلف بھی سوچتی ہے، تب بھی ہم (امریکہ) آپ کے ساتھ ہیں۔''

یاد رہے کہ سینیٹ میں ایک بل متعارف کرایا جا چکا ہے جس میں امریکہ سے کہا گیا ہے کہ آئندہ امریکی دستاویزات میں مغربی کنارے کو جودیہ اور سماریہ ہی لکھا اور پکارا جائے۔

جانسن کے اس بیان کا پس منظر یہ ہے کہ کچھ مغربی ممالک یہ کہنے لگے ہیں کہ وہ فلسطینی ریاست کو تسلیم کر لیں گے۔

بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کی قراردادوں میں یہ بات زور دے کر کہی گئی ہے کہ مغربی کنارے اور مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں یہودی بستیاں ناجائز اور غیر قانونی ہیں۔ یہ دراصل اسرائیلی نوآبادیات ہیں۔ گزشتہ سال بین الاقوامی عدالت انصاف نے اس پوزیشن کی ایک بار پھر توثیق کر دی تھی اور یہ قرار دیا تھا کہ ان علاقوں میں اسرائیل کی موجودگی غیر قانونی اور ناجائز ہے۔ اسے جلد از جلد ختم ہونا چاہیے۔

جب اقوام متحدہ کے نمائندے فرحان حق سے مائیک جانسن کے دورے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے صاف طور پر کہا کہ ان یہودی بستیوں کے بارے میں ہمارا سٹینڈ پوائنٹ بالکل واضح ہے کہ یہ یہودی بستیاں عالمی قانون کے مطابق ناجائز اور غیر قانونی ہیں۔

اسرائیل کی حکومتیں 1967ء کے بعد سے یکے بعد دیگرے یہ بستیاں صرف درآمد کیے گئے یہودیوں کے لیے تعمیر کرتی رہی ہیں۔ یہ فلسطینیوں کی جگہیں ہیں اور ان کی یہ حیثیت کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔

اب بستیوں میں درآمد شدہ یہودیوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ چوتھے جنیوا کنونشن کی توثیق کرنے والے ممالک میں اسرائیل بھی شامل ہے۔ یہ کنونشن کہتا ہے کہ کسی قابض قوت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی زیر قبضہ خطے سے اس کی آبادی کو کہیں اور منتقل کر کے کسی اور کو آباد نہیں کر سکتا۔

یاد رہے کہ اوسلو معاہدوں کے مطابق فلسطینی اتھارٹی کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ اسے بعض میونسپل اختیارات دیے گئے تھے۔ یہ اختیارات مغربی کنارے کے صرف 22 فیصد حصے پر دیے گئے اور باقی 78 فیصد حصے پر اسرائیل کی حاکمیت تسلیم کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سارے مغربی کنارے کے فضائی اختیارات بھی اسرائیل کو حاصل تھے۔

یہودی آبادکاروں کو ان بستیوں میں مکمل شہری درجہ حاصل ہے۔ فلسطینی اپنے علاقوں میں اسرائیلی فوج کے تحت رہ سکتے ہیں۔ انہیں مکمل شہری درجہ بھی حاصل نہیں ہے۔ صدر ٹرمپ کے صدر بننے سے پہلے برسوں امریکہ مغربی کنارے میں یہودی بستیوں کی تعمیر و توسیع کا مخالف رہا ہے۔ اب نہ صرف ان کی مخالفت سے دستبردار ہو چکا ہے، بل کہ ان کی حمایت میں فنڈز جاری کر رہا ہے۔ اب مائیک جانسن جیسے اہم سیاست دان دورے پر مغربی کنارے آ رہے ہیں، بل کہ یہودی بستی کا دورہ کر رہے ہیں۔

رائے سرائے: عبدالقیوم فہمید

فلسطینی ریاست تسلیم کرنے کا اعلان

مغربی ضمیر کی بیداری یا صہیونی ریاست کو بچانے کی آخری کوشش؟

جب ظالم کا ہاتھ بے گناہ اور معصوم فلسطینیوں کے خون سے رنگین ہو، جب بچوں کی لاشیں ماں کی گود میں ٹھنڈی ہو جائیں، جب ہسپتال ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیے جائیں اور جب ایک قوم کی چیخیں آسمان کو چیر ڈالیں، تب اگر مغرب فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان کرے تو یہ ضمیر کی بیداری نہیں بلکہ ایک مکروہ چال، ایک بزدلانہ دھوکہ اور ایک سیاسی سودے بازی ہوتی ہے۔

برطانیہ، فرانس اور کینیڈا جیسے ممالک قابض اسرائیل کے دیرینہ اتحادی، اس کے سیاسی اور عسکری پشتیبان اور اس کے انسانیت کے خلاف جرائم کے سہولت کار رہے، اچانک فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ وہی برطانیہ نہیں جس نے 'اعلان بالفور' کے ذریعے ارض فلسطین یہودیوں کے سپرد کی؟ کیا یہی فرانس نہیں جس نے قابض اسرائیل کو ایٹمی طاقت بنانے میں دامے درمے صہیونیوں کا ساتھ دیا؟ کیا یہی کینیڈا نہیں جو آج بھی صہیونی فوج کے لیے اسلحہ مہیا کر رہا ہے؟ اور آج یہی ریاستیں انسانیت، انصاف اور ریاستی اعتراف کا راگ الاپ رہی ہیں؟

کیا ان کی نظروں میں 60 ہزار شہداء کی لاشیں نظر نہیں آتیں؟ کیا وہ دس ہزار لاپتہ افراد اور ڈیڑھ لاکھ سے زائد زخمیوں کو نہیں دیکھتے؟ کیا انہیں وہ معصوم بچے یاد نہیں آتے جو غزہ کے ملبے تلے دب کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے؟ کیا غزہ کے مہاجرین، محصورین اور بھوکے پیاسے عوام ان کی آنکھیں نہیں کھول سکے؟ اگر یہ سب کچھ بھی ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ نہ سکا تو پھر ان کا یہ اعتراف کس لیے ہے؟ یہ اعتراف نہیں، یہ چال ہے۔ ایک مکروہ سیاسی فریب ہے جس کا مقصد صہیونی دشمن کو عالمی نفرت کے طوفان سے بچانے کی کوشش ہے تاکہ اپنے عوام کے غصے کو چند جھوٹے جملوں سے سُلا دیا جائے، تاکہ فلسطینیوں کی حقیقی مزاحمت کو دھوکہ دیا جا سکے۔

مغربی دنیا نے اس اعتراف کے ساتھ ایسی شرائط جوڑ دی ہیں جو دراصل قابض اسرائیل اور امریکہ کے دیرینہ مطالبات ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلامی تحریک مزاحمت 'حماس' اور اسلامی جہاد کو غیر مسلح کر دیا جائے، مزاحمت کو فلسطینی سیاست سے ختم کر دیا جائے اور غزہ کو خاموشی کی قبر میں دفن کر دیا جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ 33 برسوں سے جاری ایک بے معنی مذاکراتی سرکس کو دوبارہ زندہ کیا جائے، جس نے اب تک فلسطینیوں کو ایک انچ زمین تک نہ دلائی، بلکہ ہر دن، ہر مہینہ اور ہر سال ان کی زمین چھین لینے کی مجرمانہ سبیلیں تلاش کی جاتی رہیں۔

قابض اسرائیل کی درندگی کو جب فلسطینی مزاحمت کے فولادی حوصلے نے بے نقاب کر دیا، جب طوفان الاقصیٰ نے قابض دشمن کے مضبوط قلعوں کو ہلا دیا، تب مغرب کو یہ چال سوجھی۔ 2002ء میں بھی انہوں نے فلسطینی ریاست کے قیام کی بات کی تھی، مگر صرف اس لیے کہ فلسطینی انتفاضہ کو دبایا جا سکے۔ آج کی یہ تکرار دراصل اسی پرانی سازش کا نیا ورژن ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مغربی دنیا کوئی قدم امریکہ اور قابض اسرائیل کی اجازت کے بغیر نہیں اٹھاتی۔ یہ جو مغربی حکمران قابض اسرائیل کی مخالفت کا ناٹک کر رہے ہیں، دراصل کردار تقسیم کر کے ایک نیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف امریکہ یمن پر حملے کرواتا ہے تاکہ قابض اسرائیل کو غزہ میں کھلی چھوٹ ملے، دوسری طرف برطانیہ ہتھیاروں کی پروازیں چلاتا ہے تاکہ فلسطینیوں پر بم برسائے جا سکیں۔

اور پھر پوچھا جاتا ہے کہ مغرب جس فلسطینی ریاست کی بات کر رہا ہے، وہ کہاں ہے؟ کیا وہ ریاست غزہ ہے جسے خاک وخون میں ملا دیا گیا؟ یا وہ مغربی کنارہ ہے جسے قابض اسرائیل نے چپ چاپ نگل لیا؟ فلسطین کی سرزمین اب بھی قابض دشمن کے جوتوں تلے روندی جا رہی ہے اور عرب دنیا کی خاموشی، بے حسی اور غداری اس عمل کو تیز تر کرتی جا رہی ہے۔

مذاکرات، فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنا، اقوام متحدہ کی قراردادیں، سب ایک جھوٹا فریب ہیں۔ حقیقت صرف ایک ہے اور وہ ہے مزاحمت۔ یہی مزاحمت ہے جو آج بھی زندہ ہے، جو دنیا بھر میں صہیونی درندگی کے خلاف بیداری کی علامت بن چکی ہے۔ یہی مزاحمت ہے جو دنیا کو چیخ چیخ کر بتا رہی ہے کہ فلسطینی قوم مرنا جانتی ہے، لیکن غلامی قبول نہیں کرتی۔ وہ مزاحمت جو بندوق اٹھا کر دنیا کو یہ پیغام دے چکی ہے کہ ہم خاموشی سے مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے، ہم زندہ رہیں گے۔

فلسطینی ریاست صرف ایک سیاسی اعلان کا نام نہیں۔ یہ ایک شہید بچے کا خواب ہے، ایک بیوہ کی دعا ہے، ایک زخمی کی فریاد ہے، ایک محصور کی چیخ ہے، ایک قیدی کی امید ہے، اور ایک مزاحمت کار کا عزم ہے۔ اس لیے فرنگی بنیے جتنے مرضی دھوکے اور فریب کے جال تیار کریں وہ صہیونی ریاست بچا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کے جنگی جرائم پر پردہ ڈال سکتے ہیں۔

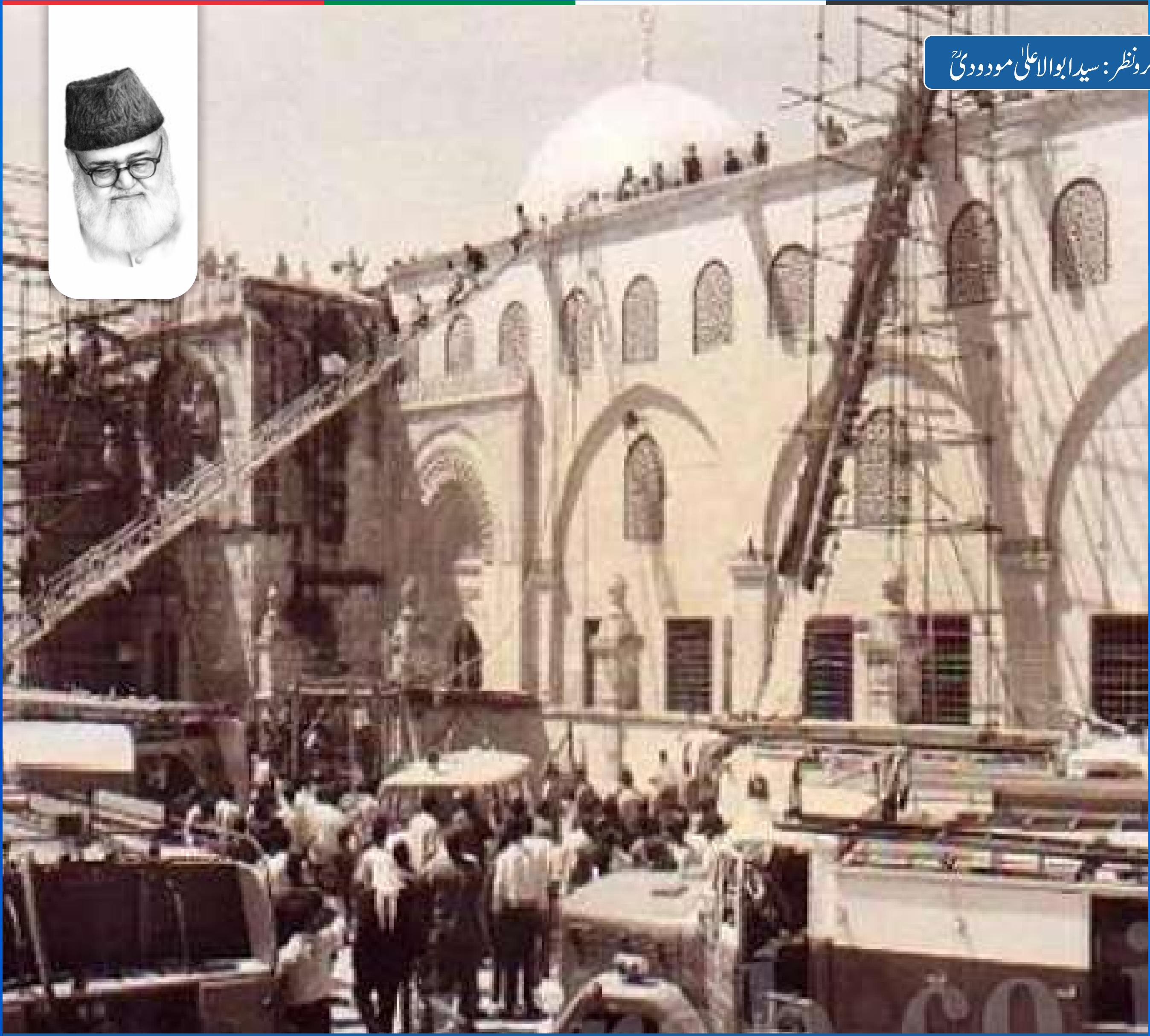

مسجد اقصیٰ میں آتشزدنی

مسجد اقصیٰ میں آتشزدنی کی دلخراش خبر ہر مسلمان کے قلب وروح پر بجلی بن کے گری ہے اورصرف پاکستان ہی کے مسلمان نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمان اس پر تڑپ اٹھے ہیں۔ اس وقت بار بار لوگوں کے ذہن میں یہ سوال ایک طوفان کی طرح اُٹھ رہا ہے کہ آخر اس مصیبت کا علاج کیا ہے؟ یہ ہماری تاریخ کے نازک ترین لمحات میں سے ایک لمحہ ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ منحوس لمحہ ہماری زندگی میں پیش آیا۔

اب سوا ارب مسلمان دنیا میں موجود ہیں اور پھر بھی یہودیوں کی یہ ہمت ہوئی کہ ہماری تین مقدس ترین مسجدوں میں سے ایک کو آگ لگا دیں، اس مسجد کو پھونک ڈالیں جسے اسلام میں قبلہ اول ہونے کا شرف حاصل ہے، جس کی طرف رُخ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے ۱۴ برس تک نماز پڑھی ہے، اور جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے۔ اس سے بڑی مصیبت امت مسلمہ کے لیے اور کیا ہوسکتی ہے۔ جس مسلمان کے دل میں دین کی ادنیٰ رمق بھی باقی ہے وہ سوچ رہا ہے کہ یہاں تک نوبت پہنچ جانے کے بعد بھی اگر ہم نے کچھ نہ کیا تو دنیا میں اس امت کی کیا آبرو باقی رہ جائے گی اور اس کے بعد ہمیں نہ معلوم اور کیسی ذلتوں سے سابقہ پیش آئے گا۔

اس نازک موقع پر یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے اس معاملے کی پوری نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں، کیونکہ اسے سمجھے بغیر ہم صحیح طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں مسجد اقصیٰ کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

اس مجرم کا اصل محرک کیا ہے

اسرائیل نے اس واقعے کے بعد مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی پے در پے کوششیں کی ہیں اور اس کے لیے بڑے اوچھے طریقے اختیار کیے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ بجلی کے تاروں میں خرابی واقع ہونے سے اتفاقاً آگ لگ گئی۔ لیکن پھر خود ہی ان مجرموں نے یہ محسوس کرلیا کہ یہ بات چلنے والی نہیں ہے۔ اتنی بڑی عمارت میں محض بجلی کے تاروں کی خرابی سے ایسی خوفناک آتش زدگی آخر کیسے ہوسکتی ہے؟

اس کے بعد نہایت ڈھٹائی اور سخت بے حیائی کے ساتھ یہ جھوٹ گھڑا گیا کہ عربوں نے خود آگ لگائی ہے۔ اس طرح کے جھوٹ کا ہم کو پہلے ہی کافی تجربہ ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ

کس قماش کے لوگ ایسے جھوٹ گھڑا کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی ہی مدت پہلے اسی لاہور میں ہمارے دفتر پر حملہ کر کے قرآن جلایا گیا اور اُلٹا ہم پر ہی یہ بہتان لگا دیا گیا کہ قرآن انہوں نے خود جلایا ہے۔ جس فلسفے کے تحت یہ جھوٹ گھڑا گیا تھا اس فلسفے کے اصل مصنف یہودی ہی ہیں۔ وہ یہودی دماغ ہی تھا جس نے اخلاق کا یہ اصول تصنیف کیا تھا کہ جس طریقے سے بھی مقصد براری ہو سکے وہ برحق ہے۔

یہودیوں کو بہت جلدی یہ محسوس ہو گیا کہ یہ دروغ بے فروغ بھی کارگر نہ ہوگا۔ اب ایک آسٹریلین نوجوان کو انہوں نے پکڑ لیا ہے اور دنیا کو یہ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس دیوانے نے کسی جنون کے دورے میں یہ حرکت کر ڈالی ہے ورنہ مسجد اقصیٰ کو منہدم کرنے کا کوئی منصوبہ اسرائیل کے پیش نظر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نوجوان پر مقدمہ چلا کر اور اپنے ایک خود ساختہ کمیشن کے ذریعہ سے تحقیقات کرا کے وہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کی پوری تاریخ بیان کر دوں جس سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ایک بڑا طویل المیعاد منصوبہ ہے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور اسی کے تحت یہ کارروائی بطور تمہید کی گئی ہے۔

یہودی عزائم کی تاریخ

بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور وہ صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتل عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کر کے امریکا پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے، اس لیے انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے، بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔ اس کے بعد آٹھویں صدی قبل مسیح میں اسیریا نے شمالی فلسطین پر قبضہ کر کے اسرائیلیوں کا بالکل قلع قمع کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو لا بسایا جو زیادہ تر عربی النسل تھیں۔

پھر چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے جنوبی فلسطین پر قبضہ کر کے تمام یہودیوں کو جلاوطن کر دیا، بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ہیکل سلیمانی (Temple of Solomon) کو، جسے دسویں قبل مسیح میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کرایا تھا، اس طرح پیوند خاک کر دیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ قائم نہ رہی۔ ایک طویل مدت کی جلاوطنی کے بعد ایرانیوں کے دور حکومت میں یہودیوں کو پھر سے جنوبی فلسطین میں آ کر آباد ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے بیت المقدس میں دوبارہ ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی۔ لیکن یہ دوسرا وقفہ بھی تین چار سو برس سے زیادہ دراز نہ ہوا۔

۷۰ عیسوی میں یہودیوں نے رومی سلطنت کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں بیت المقدس کے شہر اور ہیکل سلیمانی کو بالکل مسمار کر دیا گیا، اور پھر ایک دوسری بغاوت کو کچل کر ۱۳۵ عیسوی میں رومیوں نے پورے فلسطین سے یہودیوں کو نکال باہر کیا۔ اس دوسرے اخراج کے بعد جنوبی فلسطین میں بھی اُسی طرح عربی النسل قبائل آباد ہو گئے جس طرح شمالی فلسطین میں وہ آٹھ سو برس پہلے آباد ہوئے تھے۔ اسلام کی آمد سے پہلے یہ پورا علاقہ عربی قوموں سے آباد تھا، بیت المقدس میں یہودیوں کا داخلہ تک رومیوں نے قانوناً ممنوع کر رکھا تھا اور فلسطین میں بھی یہودی آبادی قریب قریب بالکل ناپید تھی۔

اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ:

(1) یہودی ابتداً نسل کشی (Genocide) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

(۲) شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک وہ آباد رہے۔

(۳) جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔

(۴) عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور طاقت حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انہوں نے کیا تھا۔

دو ہزار برس سے دنیا بھر کے یہودی ہفتے میں چار مرتبہ یہ دعائیں مانگتے رہے ہیں کہ بیت المقدس پھر ہمارے ہاتھ آئے اور ہم ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کریں۔ ہر یہودی گھر میں مذہبی تقریبات کے موقع پر اس تاریخ کا پورا ڈراما کھیلا جاتا رہا ہے کہ ہم مصر سے کس طرح نکلے اور فلسطین میں کس طرح سے آباد ہوئے اور کیسے بابل والے ہم کو لے گئے اور ہم کس طرح سے فلسطین سے نکالے گئے اور تتر بتر ہوئے۔ اس طرح یہودیوں کے بچے بچے کے دماغ میں یہ بات ۲۰ صدیوں سے بٹھائی جا رہی ہے کہ فلسطین تمہارا ہے اور تمہیں واپس ملنا ہے اور تمہارا مقصد زندگی یہ ہے کہ تم بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو پھر تعمیر کرو۔ بارہویں صدی عیسوی کے مشہور یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (Maimonides) نے اپنی کتاب شریعت یہود (The Code of Jewish Law) میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہر یہودی نسل کا یہ فرض ہے کہ وہ بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کو از سر نو تعمیر کرے۔"

مشہور فری میسن تحریک بھی، جس کے متعلق ہمارے ملک کے اخبارات میں قریب قریب سارے ہی حقائق اب شائع ہو چکے ہیں، اصلاً ایک یہودی تحریک ہے اور اس میں بھی ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو کو مقصود قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ پوری فری میسن تحریک کا مرکزی تصور یہی ہے اور تمام فری میسن لاجوں میں اس کا باقاعدہ ڈراما ہوتا ہے کہ کس طرح سے ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرنا ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ میں آگ لگنا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے۔ صدیوں سے یہودی قوم کی زندگی کا نصب العین یہی رہا ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کی جگہ ہیکل سلیمانی کو تعمیر کرے، اور اب بیت المقدس پر ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے اس نصب العین کو پورا کرنے سے باز رہ جائیں۔

یہودیوں کی احسان فراموشی

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک بات کی اور وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے ۷۰ عیسوی میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا اس وقت یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہ تھا بلکہ کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مساجد بنائی تھیں۔ یہ بات بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ رومیوں کے زمانے میں

فلسطین یہودیوں سے خالی کر لیا گیا تھا اور بیت المقدس میں تو ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔ یہ مسلمانوں کی شرافت تھی کہ انہوں نے پھر انہیں وہاں رہنے اور بسنے کی اجازت دی۔

تاریخ اس بات پر بھی شاہد ہے کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں یہودیوں کو اگر کہیں امن نصیب ہوا ہے تو وہ صرف مسلمان ملک تھے، ورنہ دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی عیسائیوں کی حکومت رہی وہاں وہ ظلم وستم کا نشانہ ہی بنتے رہے۔ یہودیوں کے اپنے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی تاریخ کا سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جب وہ اندلس میں مسلمانوں کی رعایا کی حیثیت سے آباد تھے۔ یہ دیوار گریہ جس کو آج یہودی اپنی سب سے بڑی مقدس یادگار سمجھتے ہیں، یہ بھی مسلمانوں ہی کی عنایت سے انہیں ملی تھی۔ بمبئی سے اسرائیل حکومت کا ایک سرکاری بلیٹن (News from Israel) شائع ہوتا ہے اس کی جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ دیوار گریہ پہلے ملبے اور کوڑے کرکٹ میں دبی ہوئی تھی اور اس کا کوئی نشان تک لوگوں کو معلوم نہ تھا۔ ۱۶ ویں صدی عیسوی میں سلطان سلیم عثمانی کو اتفاقاً اس کے وجود کا علم ہوا اور اس نے اس جگہ کو صاف کر کے یہودیوں کو اس کی زیارت کی اجازت عطا کی۔ لیکن یہودی ایک ایسی احسان فراموش قوم ہے کہ وہ مسلمانوں کی شرافت فیاضی اور حسن سلوک کا بدلہ آج اس شکل میں ان کو دے رہی ہے۔

یہودیوں کی منصوبہ بندی

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ ان ظالموں نے کس طرح با قاعدہ منصوبہ بندی کر کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ سب سے پہلے ان کے ہاں ایک تحریک شروع ہوئی کہ مختلف علاقوں سے یہودی ہجرت کر کر کے فلسطین میں جا کر آباد ہوں اور وہاں زمینیں خریدنی شروع کریں۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء سے اس مہاجرت کا سلسلہ شروع ہوا اور زیادہ تر مشرقی یورپ سے یہودی خاندان وہاں منتقل ہونے لگے۔ اس کے بعد مشہور یہودی لیڈر تھیوڈور ہرتزل نے ۱۸۹۷ء میں صیہونی تحریک Zionist Movement کا باقاعدہ آغاز کیا اور اس میں اس بات کو مقصود قرار دیا گیا کہ فلسطین پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا جائے اور ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی جائے۔ یہودی سرمایہ داروں نے اس غرض کے لیے بڑے پیمانے پر مالی امداد فراہم کی کہ فلسطین منتقل ہونے والے یہودی خاندان نے وہاں زمینیں خریدیں اور منظم طریقے سے اپنی بستیاں بسائیں۔

پھر ۱۹۰۱ء میں ہرتزل نے سلطان عبدالحمید خاں (سلطان ترکی) کو باقاعدہ یہ پیغام بھجوایا کہ یہودی ترکی کے تمام قرضے ادا کرنے کو تیار ہیں، آپ فلسطین کو یہودیوں کو قومی وطن بنانے کی اجازت دے دیں۔ مگر سلطان عبدالحمید خاں نے اس پیغام پر تھوک دیا اور صاف کہہ دیا کہ جب تک میں زندہ ہوں اور جب تک ترکی سلطنت موجود ہے اس "وقت تک اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ فلسطین یہودیوں کے حوالے کیا جائے۔ تمہاری ساری دولت پر میں تھوکتا ہوں"۔ جس شخص کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا گیا تھا اس کا نام تھا حاخام قرہ صوآفندی۔ یہ سالونیکا کا یہودی باشندہ تھا اور ان یہودی خاندانوں میں سے تھا جو اسپین سے نکالے جانے کے بعد ترکی میں آباد ہوئے تھے۔ ترکی رعایا ہونے کے باوجود اس نے یہ جرات کی کہ سلطان ترکی کے دربار میں پہنچ کر فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ پیش کرے۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ سلطان عبدالحمید خاں کا جواب سُن کر ہرتزل کی طرف سے ان کو صاف صاف یہ دھمکی دے دی گئی کہ تم اس کا بُرا نتیجہ دیکھو گے۔

چنانچہ اس کے بعد فوراً ہی سلطان عبدالحمید کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازشیں شروع ہو گئیں جن میں فری میسن، دونمہ (یہ وہ یہودی تھے جنھوں نے ریا کارانہ اسلام قبول کر رکھا تھا۔ ترک ان کو دونمہ کہتے ہیں) اور وہ مسلمان نوجوان شریک تھے جو مغربی تعلیم کے زیر اثر آ کر ترکی قوم پرستی کے علمبردار بن گئے تھے۔ ان لوگوں نے ترکی فوج میں اپنے اثرات پھیلائے اور سات سال کے اندر ان کی سازشیں پختہ ہو کر اس منزل پر پہنچ گئیں کہ سُلطان عبدالحمید کو معزول کر دیں۔ اس موقع پر جو انتہائی عبرتناک واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ۱۹۰۸ء میں جو تین آدمی سلطان کی معزولی کا پروانہ لے کر اُن کے پاس گئے تھے اُن میں دو ترک تھے اور تیسرا وہی حاخام قرہ صوآفندی تھا جس کے ہاتھ ہرتزل نے فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے کا مطالبہ سلطان کے پاس بھیجا تھا۔ مسلمانوں کی بے غیرتی کا اس سے اندازہ کیجیے کہ اپنے سلطان کی معزولی کا پروانہ بھیجتے بھی ہیں تو ایک ایسے یہودی کے ہاتھ جو سات ہی برس پہلے اسی سلطان کے پاس فلسطین کی حوالگی کا مطالبہ لے کر گیا تھا اور اس سے سخت جواب سن کر آیا تھا۔ ذرا تصور کیجیے کہ سلطان کے دل پر کیا گزری ہو گی جب وہی یہودی ان کی معزولی کا پروانہ لیے ہوئے ان کے سامنے کھڑا تھا۔

ترکی اور عربی قوم پرستی کا تصادم

اسی زمانے میں ایک دوسری سازش بھی زور وشور سے چل رہی تھی جس کا مقصد ترکی سلطنت کے ٹکڑے اُڑانا تھا اور اس سازش میں بھی مغربی سیاست کاروں کے ساتھ ساتھ یہودی دماغ ابتدا سے کارفرما رہا۔ ایک طرف ترکوں میں یہ تحریک اٹھائی گئی کہ وہ سلطنت کی بنیاد اسلامی اخوت کے بجائے ترکی قوم پرستی پر رکھیں، حالانکہ ترکی سلطنت میں صرف ترک ہی آباد نہیں تھے بلکہ عرب اور کرد اور دوسری نسلوں کے مسلمان بھی تھے۔ ایسی سلطنت کو صرف ترکی قوم کی سلطنت قرار دینے کے صاف معنی یہ تھے کہ تمام غیر ترک مسلمانوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ختم ہو جائیں۔ دوسری طرف عربوں کو عربی قومیت کا سبق پڑھایا گیا اور ان کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی جدوجہد کریں۔ عربوں میں اس عرب قوم پرستی کا فتنہ اٹھانے والے عیسائی عرب تھے، بیروت اس کا مرکز تھا، اور بیروت کی امریکن یونیورسٹی اس کو فروغ دینے کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ اس طرح ترکوں اور عربوں میں بیک وقت دو متضاد قسم کی قوم پرستیاں ابھاری دی گئیں اور ان کو یہاں تک بھڑکایا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں جب پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی تو ترک اور عرب ایک دوسرے کے رفیق ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے دشمن اور خون کے پیاسے بن کر آمنے سامنے کھڑے ہو گئے۔

جنگ عظیم اول اور اعلان بالفور

پہلی جنگ عظیم میں ابتداء یہودیوں نے حکومت جرمنی سے معاملہ کرنا چاہا تھا، کیونکہ جرمنی میں اُس وقت یہودیوں کا اتنا ہی زور تھا جتنا آج امریکا میں ہے۔ انہوں نے قیصر ولیم سے یہ وعدہ لینے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دے گا۔ لیکن جس وجہ سے یہودی اس پر یہ اعتماد نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ایسا کرے گا وہ یہ تھی کہ ترکی حکومت اس وقت جنگ میں جرمنی کی حلیف تھی۔ یہودیوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ قیصر ولیم ہم سے یہ وعدہ پورا کر سکے گا۔ اس موقع پر ڈاکٹر وائزمین (Weizman.Dr) آگے بڑھا اور اس نے انگلستان کی حکومت کو یہ یقین دلایا کہ جنگ میں تمام دنیا کے یہودیوں کا سرمایہ اور تمام دنیا کے یہودیوں کا دماغ اور ان کی ساری قوت وقابلیت انگلستان اور فرانس کے ساتھ آ سکتی ہے اگر آپ ہم کو یہ یقین دلا دیں کہ آپ فتحیاب ہو کر فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنا دیں گے۔

ڈاکٹر وائزمین ہی اس وقت یہودیوں کے قومی وطن کی تحریک کا علمبردار تھا۔ آخر کار اس نے ۱۹۱۷ء میں انگریزی حکومت سے وہ مشہور پروانہ حاصل کرلیا جو اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انگریزوں کی بددیانتی کا شاہکار ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کو یقین دلا رہے تھے کہ ہم عربوں کی خود مختار ریاست بنائیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے شریف حسین کو تحریری وعدہ دے دیا تھا اور اسی وعدے کی بنیاد پر عربوں نے ترکوں سے بغاوت کر کے فلسطین اور عراق اور شام پر انگلستان کا قبضہ کرا دیا تھا۔ دوسری طرف وہی انگریز یہودیوں کو باقاعدہ یہ تحریر دے رہے تھے کہ ہم فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنائیں گے۔ یہ اتنی بڑی بے ایمانی تھی کہ جب تک انگریزی قوم دنیا میں موجود ہے وہ اپنی تاریخ پر سے اس کلنک کے ٹیکے کو نہ مٹا سکے گی۔

پھر ذرا غور کیجیے کہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کے آخر معنی کیا تھے؟ کیا فلسطین کوئی خالی پڑی ہوئی زمین تھی جس پر کسی قوم کو آباد کر دینے کا وعدہ کیا جا رہا تھا؟ وہاں دو ڈھائی ہزار برس سے ایک قوم آباد چلی آ رہی تھی۔ اعلان بالفور کے وقت وہاں یہودیوں کی آبادی پوری ۵ فیصدی بھی نہ تھی۔ ایسے ملک کے متعلق سلطنت برطانیہ کا وزیر خارجہ یہ تحریری وعدہ دے رہا تھا کہ ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن بنایا جائے گا جو دنیا بھر میں 19 سو برس سے بکھری ہوئی تھی۔ اس کا صاف مطلب گویا یہ وعدہ کرنا تھا کہ ہم تمہیں موقع دیں گے کہ جس وطن پر ہم نے خود عربوں کی مدد سے قبضہ کیا ہے اس سے تم انہی عربوں کو نکال باہر کرو اور ان کی جگہ دنیا کے گوشے گوشے سے اپنے افراد کو لا کر بسا دو۔ یہ ایک ایسا ظلم تھا جس کی نظیر پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس زخم پر نمک پاشی یہ ہے کہ لارڈ بالفور نے اپنے اس خط کے متعلق اپنی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے تھے:

ہمیں فلسطین کے متعلق کوئی فیصلہ کرتے ہوئے وہاں کے موجودہ باشندوں سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صیہونیت ہمارے لیے ان سات لاکھ عربوں کی خواہشات اور تعصّبات سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اُس قدیم سرزمین میں اس وقت آباد ہیں۔

بالفور کی ڈائری کے یہ الفاظ آج بھی برطانوی پالیسی کی دستاویزات (Documents of British Policy) کی جلد دوم میں ثبت ہیں۔

مجلس اقوام کی کارگزاری

فلسطین پر انگریزوں کے قبضے اور لارڈ بالفور کے اعلان سے یہودیوں کے طویل المیعاد منصوبے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا۔ ۱۸۸۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۷ء تک اس مرحلے کی تکمیل میں ۳۷ سال صرف ہوئے۔ اس کے بعد اس منصوبے کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں مجلس اقوام (League of Nations) اور اس کی اصل کار فرما دو بڑی طاقتوں، برطانیہ اور فرانس نے بالکل اس طرح کام کیا گویا وہ آزاد سلطنتیں نہیں ہیں بلکہ محض صہیونی تحریک کی ایجنٹ ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مجلس اقوام نے فیصلہ کیا کہ فلسطین کو انگریزوں کے آنے انتداب Mandate (انتداب کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت بطور خود کسی ملک کی فرمانروائی نہیں کر رہی ہے بلکہ مجلس اقوام کی طرف سے اس کے سپرد کام کیا گیا ہے کہ وہ وہاں خاص شرائط کے تحت فرمانروائی کرے۔

۱۹۱۷ء میں یہودی آبادی صرف ۵۶ ہزار تھی۔ پانچ سال کے اندر وہ بڑھ کر ۸۳ ہزار کے قریب پہنچ گئی) میں دے دیا جائے۔ اس موقع پر فلسطین میں جو مردم شماری کرائی گئی تھی اس میں مسلمان عرب ۶۶۰۶۴۱، عیسائی عرب ۷۱۴۶۴، اور یہودی ۸۲۷۹۰ تھے، اور یہودیوں کی اتنی آبادی بھی اس وجہ سے تھی کہ وہ دھڑا دھڑ وہاں جا کر آباد ہو رہے تھے۔۔

اس پر بھی مجلس اقوام نے برطانیہ کو انتداب کا پروانہ دیتے ہوئے پوری بے شرمی کے ساتھ یہ ہدایت کی کہ اُس کی یہ ذمہ داری ہو گی کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کرے صہیونی تنظیم کو سرکاری طور پر باقاعدہ تسلیم کر کے اسے نظم ونسق میں شریک کرے اور اس کے مشورے اور تعاون سے یہودی قومی وطن کی تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اس کے ساتھ وہاں کے قدیم اور اصل باشندوں کے لیے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا گیا کہ ان کے مذہبی اور مدنی (Civil) حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ سیاسی حقوق کا اس میں سرے سے کوئی ذکر نہ تھا۔

یہ تھا اس مجلس اقوام کا انصاف جسے دنیا میں امن قائم کرنے کا نام لے کر وجود میں لایا گیا تھا۔ اس نے یہودیوں کو باہر سے لا کر بسانے والوں کو تو سیاسی اقتدار میں شریک کر دیا، اور ملک کے اصل باشندوں کو اس کا مستحق بھی نہ سمجھا کہ ان کے سیاسی حقوق کا برائے نام بھی تذکرہ کر دیا جاتا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُس وقت دُنیا کی بڑی بڑی حکومتوں اور مجلس اقوام میں یہودیوں نے کتنے اثرات پیدا کر لیے تھے جن کی بدولت فلسطین کو انگریزوں کے انتداب میں دیتے ہوئے یہ ہدایات جاری کی گئی تھیں۔

انگریزی انتداب کا کارنامہ

یہ انتداب حاصل کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں لا کر بسانے کا باقاعدہ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ فلسطین کا پہلا برطانوی ہائی کمشنر سر ہربرٹ سیمویل خود ایک یہودی تھا۔ صہیونی تنظیم کو عملاً حکومت کے نظم ونسق میں شریک کیا گیا اور اس کے سپرد نہ صرف تعلیم اور زراعت کے محکمے کیے گئے بلکہ بیرونی ممالک سے لوگوں کے داخلے، سفر اور قومیت کے معاملات بھی اس کے حوالے کر دیئے گئے۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ سے باہر کے یہودیوں کو فلسطین میں آ کر زمینیں حاصل کرنے کی پوری سہولتیں دی گئیں۔ مزید براں اُن کو زمینیں کاشت کرنے کے لیے قرضوں اور تقاوی اور دوسری سہولتوں سے بھی نوازا گیا۔ عربوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے اور ٹیکسوں کے بقایا پر ہر بہانے عدالتوں نے زمینیں ضبط کرنے کی ڈگریاں دینی شروع کر دیں۔

ضبط شدہ زمینیں یہودیوں کے ہاتھ فروخت کی گئیں اور سرکاری زمینوں کے بھی بڑے بڑے رقبے یہودی نو آبادکاروں کو کہیں مفت اور کہیں برائے نام پٹے پر دے دیے گئے۔ بعض مقامات پر کسی نہ کسی بہانے پورے پورے گاؤں صاف کر دیے گئے اور وہاں یہودی بستیاں بسائی گئیں۔ ایک علاقے میں تو ۸ ہزار عرب کاشتکاروں اور زراعتی کارکنوں کو ۵۰ ہزار ایکڑ زمین سے حکماً بے دخل کر دیا گیا اور ان کو فی کس تین پونڈ دس شلنگ دے کر چلتا کر دیا گیا۔ ان تدبیروں سے ۱۷ سال کے اندر یہودی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ۸۲ ہزار سے کچھ زائد تھے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد ساڑھے چار لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز فلسطین میں صرف صیہونیت کی خدمت انجام دیتے رہے اور ان کے ضمیر نے ایک دن بھی ان کو یہ احساس نہ دلایا کہ کسی ملک کی حکومت پر اس کے اصل باشندوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن کی نگہداشت کرنا اس کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

جنگ عظیم دوم کے زمانے میں معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ہٹلر کے مظالم سے بھاگنے والے یہودی ہر قانونی اور غیر قانونی طریقے سے بے تحاشا فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ صہیونی ایجنسی نے ان کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملک کے اندر گھسانا شروع کیا، اور مسلح تنظیمیں قائم کیں جنہوں نے ہر طرف مار دھاڑ کر کے عربوں کو بھگانے

اور یہودیوں کو ان کی جگہ بسانے میں سفا کی کی حد کر دی۔ انگریزی انتداب کی ناک کے نیچے یہودیوں کو ہر طرح کے ہتھیار پہنچ رہے تھے اور وہ عربوں پر چھاپے مار رہے تھے۔ مگر قانون صرف عربوں کے لیے تھا جو انہیں ہتھیار رکھنے اور ظلم کے جواب میں مدافعت کرنے سے روک رہا تھا۔ البتہ برطانوی حکومت جان بچا کر بھاگنے والے عربوں کو نقل مکانی کی سہولتیں فراہم کرنے میں بڑی فراخ دل تھی۔ اس طرح ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ۳۰ سال کے اندر یہودی منصوبے کا دوسرا مرحلہ مکمل ہوا جس میں وہ اس قابل ہو گئے کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کے بجائے فلسطین میں ان کی قومی ریاست قائم کردیں۔

”قومی وطن“ سے ”قومی ریاست“ تک:

۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت نے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) نے صہیونیت کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ ہم انجام دے چکے ہیں۔ اب آگے کا کام اُس آنجہانی مجلس کی نئی جانشین اقوام متحدہ انجام دے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ یہ دوسری مجلس جو دنیا میں امن وانصاف کے قیام کی علمبردار بن کر اٹھی تھی اس نے فلسطین میں کیا انصاف قائم کیا۔

نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فلسطین کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان تقسیم کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ یہ فیصلہ ہوا کس طرح؟ اس کے حق میں ۳۳ ووٹ اور اس کے خلاف ۱۳ ووٹ تھے۔ دس ملکوں نے کوئی ووٹ نہیں دیا۔ یہ کم سے کم اکثریت تھی جس سے جنرل اسمبلی میں کوئی ریزولیشن پاس ہوسکتا تھا۔ چند روز پہلے تک اس تجویز کے حق میں اتنی اکثریت بھی نہ تھی۔ صرف ۳۰ ملک اس کے حق میں تھے۔ آخر کار امریکا نے غیر معمولی دباؤ ڈال کر ہائٹی، فلپائن اور لائبیریا کو مجبور کر کے اس کی تائید کرائی۔

یہ بات خود امریکن کانگریس کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ یہ تین ووٹ زبردستی حاصل کیے گئے تھے اور جیمز فوریسٹال اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ اس معاملہ میں دوسری قوموں پر دباؤ ڈالنے اور ان کو ووٹ دینے پر مجبور کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کیے گئے وہ شرمناک کارروائی (Scandal) کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

تقسیم کی جو تجویز ان ہتھکنڈوں سے پاس کرائی گئی اس کی رو سے فلسطین کا ۵۵ فی صدی رقبہ ۳۳ فیصدی یہودی آبادی کو اور ۴۵ فی صدی رقبہ ۶۷ فی صدی عرب آبادی کو دیا گیا، حالانکہ اُس وقت تک فلسطین کی زمین کا صرف 4 فی صدی حصہ یہودیوں کے قبضے میں آیا تھا۔ یہ تھا اقوام متحدہ کا انصاف! لیکن یہودی اس بندر بانٹ سے بھی راضی نہ ہوئے اور انہوں نے مار دھاڑ کر کے عربوں کو نکالنا اور ملک کے زیادہ سے زیادہ حصے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں جو مظالم عربوں پر کیے گئے، آرنلڈ ٹائن بی ان کے متعلق اپنی کتاب A study of History میں کہتا ہے کہ وہ کسی طرح بھی ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے خود یہودیوں پر کیے تھے۔

دیر یاسین میں ۹ - اپریل ۴۸ء کے قتل عام کا خاص طور پر اس نے ذکر کیا ہے جس میں عرب عورتوں، بچوں اور مردوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا، عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس سڑکوں پر نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ یہ اعلان کرتے پھرے کہ ہم نے دیر یاسین کی عرب آبادی کے ساتھ یہ اور یہ کیا ہے، اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتو یہاں سے نکل جاؤ“۔ ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ کیا یہ کسی ایسی قوم کا کارنامہ ہوسکتا ہے جس میں رمق برابر بھی شرافت وانسانیت موجود ہو؟

ان حالات کے دوران میں ۱۴ مئی ۴۸ء کو معین اُس وقت جبکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی فلسطین کے مسئلے پر پھر بحث کر رہی تھی، یہودی ایجنسی نے رات کے دس بجے اسرائیلی ریاست کے قیام کا باقاعدہ اعلان کر دیا اور سب سے پہلے امریکا اور روس نے آگے بڑھ کر اس کو تسلیم کیا، حالانکہ اس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی ریاست قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔ اس اعلان کے وقت تک ۶ لاکھ سے زیادہ عرب گھر سے بے گھر کیے جا چکے تھے، اور اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف یروشلم (بیت المقدس) کے آدھے سے زیادہ حصے پر اسرائیل قبضہ کر چکا تھا۔

ریاست اسرائیل کے قیام کا اعلان ہونے کے بعد گردوپیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا غریب آبادی کو مار دھاڑ اور لوٹ مار سے بچانے کے لیے مداخلت کی اور ان کی فوجیں فلسطین میں داخل ہوگئیں۔ لیکن یہودی اُس وقت تک اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ یہ سب ریاستیں مل کر بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ بلکہ جب نومبر ۴۸ء میں اقوام متحدہ نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا اس وقت فلسطین کے رقبے کا ۷۷ فیصدی سے بھی کچھ زیادہ حصہ یہودیوں کے قبضہ میں جا چکا تھا۔

سوال یہ ہے کہ یہودیوں کو اتنی جنگی طاقت کس نے فراہم کر دی تھی کہ پانچ عرب ریاستوں کی متحدہ طاقت بھی ان کا مقابلہ نہ کر سکی؟ اس طاقت کے فراہم کرنے میں سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام دونوں شریک تھے اور سب سے زیادہ ہتھیار اس جنگ کے لیے چیکوسلوواکیا سے آئے تھے جو آج خود ظلم وستم کا شکار ہے۔ اقوام متحدہ میں بھی جو بحثیں اس زمانے میں ہوئیں ان کا ریکارڈ شاہد ہے کہ یہودیوں کی حمایت اور عربوں کی مخالفت میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام، دونوں کے علمبردار ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے، اور یہ کہنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون یہودیوں کا زیادہ حامی ہے۔

یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ

اس کے بعد یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ شروع ہوا جو ۱۹ سال کے اندر جون ۶۷ء کی جنگ میں بیت المقدس اور پورے باقی ماندہ فلسطین اور پورے جزیرہ نمائے سینا اور سرحد شام کی بالائی پہاڑیوں پر اسرائیل کے قبضے سے تکمیل تک پہنچا۔

نومبر ۴۸ء میں اسرائیلی ریاست کا رقبہ ۷۹۹۳ مربع میل تھا۔ جون ۶۷ء کی جنگ میں اس کے اندر ۲۷ ہزار مربع میل کا اضافہ ہوگیا اور ۱۵ لاکھ عرب یہودیوں کے غلام بن گئے۔ اس مرحلے میں اسرائیل کے منصوبے کی کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر امریکا اس کا حامی و مددگار اور پشت پناہ بنا رہا۔ برطانیہ اور فرانس اور دوسرے مغربی ممالک بھی اپنی اپنی حد تک اس کی تائید وحمایت کا پورا حق ادا کرتے رہے۔ روس اور اس کا مشرقی بلاک بھی کم از کم ۵۵ء تک علانیہ اس کا حامی رہا اور بعد میں اس نے اگر اپنی پالیسی بدلی بھی تو وہ عرب ملکوں کے لیے مفید ہونے کے بجائے اسرائیل ہی کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

۵۵ء میں جب عرب ممالک اس بات سے بالکل مایوس ہو گئے کہ امریکا اور دوسرے مغربی ملکوں سے ان کو اسرائیل کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار مل سکیں گے تو انہیں مجبوراً اشتراکی بلاک کی طرف رجوع کرنا پڑا اور اس بلاک کے ملکوں نے اس لالچ میں ان کو ہتھیار دینے شروع کیے کہ اس طرح انہیں عرب ممالک میں اشتراکیت پھیلانے

اور ان کو اپنے کرہ اثر میں لانے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے نتیجے میں یہ تو نہ ہو سکا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جاتے، البتہ یہ ضرور ہوا کہ روس کو مصر و شام سے یمن تک اور عراق سے الجزائر تک اپنے اثرات پھیلانے کا موقع حاصل ہو گیا اور عرب ملکوں میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی کشمکش اتنی بڑھی کہ اسرائیل سے نمٹنے کے بجائے وہ آپس ہی میں ایک دوسرے سے الجھ کر رہ گئے۔

۱۹ برس کی اس مدت میں امریکا نے اسرائیل کو ایک ارب ۶۰ کروڑ ڈالر کی مالی امداد دی۔ مغربی جرمنی سے اس کو ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ڈالر کا تاوان دلوایا گیا۔ اور دنیا بھر کے یہودیوں نے دو ارب ڈالر سے زیادہ چندے دے کر اس کی مالی پوزیشن مضبوط کی۔ جنگی حیثیت سے اس کو زفرق تا بقدم اس قدر مسلح کر دیا گیا کہ جون ۶۷ء کی جنگ سے پہلے ہی امریکی ماہرین کا یہ اندازہ تھا کہ وہ صرف چار پانچ دن کے اندر اپنے گرد و پیش کی تمام عرب ریاستوں کو پیٹ لے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکا اور اس کے ساتھ اس کی پشت پناہی کرتے رہے اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا کوئی تدارک نہ کر سکی۔ نومبر ۴۷ء سے ۵۷ء تک اقوام متحدہ کے ۲۸ ریزولیوشن وہ اُس کے منہ پر مار چکا تھا۔

ستمبر ۴۸ء سے نومبر ۶۶ء تک کے مرتبہ اقوام متحدہ نے اس کے خلاف مذمت کی قرارداد یں پاس کیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کی بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ جون ۶۷ء کی جنگ کے بعد جب جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا اُس وقت اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان یہ کہا کہ اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہی ہمارے حق میں رہ جائے، تب بھی ہم اپنے مفتوحہ علاقوں سے نہ نکلیں گے"۔ یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہے کہ امریکا اور اس کے ساتھیوں کی حمایت کے بل پر اسرائیل تمام دنیا کی رائے کو ٹھوکر پر مارتا ہے اور اقوام متحدہ اس کے مقابلے میں قطعی بے بس ہے۔

امریکا کی دلچسپی اسرائیل کے ساتھ کتنی بڑھی ہوئی ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ ذرا اس رویے پر ایک نگاہ ڈال لیں جو جون ۶۷ء کی جنگ کے موقع پر اس نے اختیار کیا تھا۔ جنگ سے ایک ہفتہ پہلے امریکی فوج کے جائنٹ چیفس آف اسٹاف کے صدر جنرل وہیلر نے صدر جانسن کو اطمینان دلایا تھا کہ اگر اسرائیل بڑھ کر پہلے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو پھر زیادہ سے زیادہ تین چار دن کے اندر وہ عربوں کو مار لے گا۔ لیکن اس رپورٹ پر بھی جانسن صاحب پوری طرح مطمئن نہ ہو سکے اور انہوں نے سی آئی اے کے چیف رچرڈ ہیلیمس (Helms) سے رپورٹ طلب کی۔ جب اس نے بھی وہیلر کے اندازوں کی توثیق کر دی تو جانسن صاحب نے روس سے رجوع کر کے یہ اطمینان حاصل کیا کہ وہ عربوں کی مدد کے لیے عملاً کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ اس کے بعد کہیں جا کر اسرائیل پر وحی (اس لفظ پر چونکیے نہیں۔ شیاطین بھی اپنے اولیاء پر "وحی" کیا کرتے ہیں) نازل ہوئی کہ اب عرب ملکوں پر حملہ کر دینے کا مناسب موقع آ گیا ہے۔ اس پر بھی امریکا کا چھٹا بحری بیڑہ مصر و اسرائیل کے سواحل کے قریب اپنی پوری طاقت کے ساتھ مستعد کھڑا تھا تا کہ بوقت ضرورت کام آ سکے۔

انگریزوں کی اسرائیل نوازی کا حال یہ تھا کہ ان کا ایک طیارہ بردار بحری جہاز مالٹا میں اور دوسرا عدن میں ایک منٹ کے نوٹس پر اسرائیل کی مدد پر حرکت کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جنگ کے بعد لندن سنڈے ٹائمز نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا the holy war june 67۔ اس کا جو باب بیت المقدس پر یہودی قبضے کے بیان میں ہے اس کا عنوان رکھا گیا ہے (YearsBack After 896) یعنی ۸۹۶ برس کے بعد واپسی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ سال پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ اٹھا تھا نہ کہ یہودیوں کا۔ اس کے صاف معنی یہ نہیں کہ اسرائیل کے ساتھ انگریزوں کی ہمدردی میں صلیبی جذبہ کام کر رہا تھا اور اس لڑائی کو وہ صلیبی جنگوں ہی کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

روس کی عرب دوستی کا حال یہ تھا کہ جس صبح کو مصر کے ہوائی اڈوں پر اسرائیل کا حملہ ہونے والا تھا اس کی رات کو روس نے صدر ناصر کو اطمینان دلایا تھا کہ کوئی حملہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ ویسی ہی یقین دہانی تھی جیسی ستمبر ۶۵ء میں ہم کو کرائی گئی تھی کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہ کرے گا! عربوں کے ساتھ روس کے رویے پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بڑا سبق آموز ہے کہ ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے"۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے یہودیوں کا تیسرا منصوبہ بھی کامیاب ہو گیا اور بیت المقدس سمیت پورا فلسطین جزیرہ نمائے سینا سمیت ان کے ہاتھ آ گیا۔

یہودیوں کا چوتھا منصوبہ

اب درحقیقت جس چیز سے دنیائے اسلام کو سابقہ درپیش ہے وہ یہودیوں کا چوتھا اور آخری منصوبہ ہے جس کے لیے وہ دو ہزار سال سے بے تاب تھے اور جس کی خاطر وہ ۹۰ سال سے باقاعدہ ایک اسکیم کے مطابق کام کرتے رہے ہیں۔

اس منصوبے کے اہم ترین اجزا دو ہیں۔ ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبۂ صخرہ کو ڈھا کر ہیکل سلیمانی پھر سے تعمیر کیا جائے، کیونکہ اس کی تعمیر ان دونوں مقامات مقدسہ کو ڈھائے بغیر نہیں ہو سکتی۔ دوسرے یہ کہ اُس پورے علاقے پر قبضہ کیا جائے جسے اسرائیل اپنی میراث سمجھتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس منصوبے کے ان دونوں اجزا کو ہر مسلمان اچھی طرح سمجھ لے۔ جہاں تک پہلے جزو کا تعلق ہے اسرائیل اسے عملی جامہ پہنانے پر اسی وقت قادر ہو چکا تھا جب بیت المقدس پر اس کا قبضہ ہوا تھا۔ لیکن دو وجوہ سے وہ اب تک اس کام میں تامل کرتا رہا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ اسے اور اس کے سرپرست امریکا کو دنیائے اسلام کے شدید ردعمل کا اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ خود یہودیوں کے اندر مذہبی بنیاد پر اس مسئلے میں اختلاف برپا ہے۔

ان کے ایک گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہیکل کی تعمیر نو مسیح ہی آ کر کرے گا، جب تک وہ نہ آ جائے ہمیں انتظار کرنا چاہیے (واضح رہے کہ مسلمان اور عیسائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح مانتے ہیں، مگر یہودی ان کا انکار کرتے ہیں اور وہ ابھی تک مسیح (Promised Messiahy) کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا یہ مسیح موعود وہی ہے جسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسیح دجال قرار دیا ہے)۔ یہ ان کے قدامت پسند گروہ کا خیال ہے۔

دوسرا گروہ جو جدت پسند ہے، اور جس کے ہاتھ میں دراصل اس وقت اسرائیل کے اقتدار کی باگیں ہیں، کہتا ہے کہ قدیم بیت المقدس اور دیوار گریہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ہم دور مسیحائی (Messianic Era) میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہی بات یہودی فوج کے چیف ربی (جس طرح ہماری فوج کے ساتھ پیش امام ہوتے ہیں اسی طرح یہودی فوج کے ساتھ ربی ہوتے ہیں اور ان کے چیف ربی کو اسرائیلی فوج میں بریگیڈ جنرل کا رینک حاصل ہے) نے تورات ہاتھ میں لے کر اُس روز کہہ دی تھی جب بیت المقدس کی فتح کے

بعد وہ دیوارِ گریہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ یہ تھے کہ آج ہم ملت یہود کے لیے دورِ مسیحائی میں داخل ہو رہے ہیں۔

انہی دو وجوہ سے مسجد اقصیٰ کو یک لخت ڈھا دینے کے بجائے تمہید کے طور پر اس کو آگ لگائی گئی ہے تا کہ ایک طرف دنیائے اسلام کا ردِعمل دیکھ لیا جائے اور دوسری طرف یہودی قوم کو آخری کارروائی کے لیے بتدریج تیار کیا جائے۔ دوسرا جزو اِس منصوبے کا یہ ہے کہ میراث کے ملک پر قبضہ کیا جائے۔ یہ میراث کا ملک کیا ہے؟ اسرائیل کی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ الفاظ کندہ ہیں:

اے اسرائیل، تیری سرحدیں نیل سے فرات تک ہیں۔

دنیا میں صرف ایک اسرائیل ہی ایسا ملک ہے جس نے کھلم کھلا دوسری قوموں کے ملک پر قبضہ کرنے کا ارادہ معین اپنی پارلیمنٹ کی عمارت پر ثبت کر رکھا ہے۔ کسی دوسرے ملک نے اس طرح علانیہ اپنی جارحیت کے ارادوں کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس منصوبے کی جو تفصیل صہیونی تحریک کے شائع کردہ نقشے میں دی گئی ہے اس کی رُو سے اسرائیل جن علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ان میں دریائے نیل تک مصر، پورا اُردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی علاقہ، اور جگر تھام کر سُنیے کہ مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔ اگر دُنیائے عرب اسی طرح کمزور رہی جیسی آج ہے، اور خدانخواستہ دنیائے اسلام کا ردِعمل بھی مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی پر کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکا، تو پھر خاکم بدہن ایک دن ہمیں وہ بھی دیکھنا پڑے گا جب یہ دشمنانِ اسلام اپنے ان ناپاک ارادوں کو پورا کرنے کے لیے پیش قدمی کر بیٹھیں گے۔

پس چہ باید کرد؟

حضرات، اتنی تفصیل میں نے اس لیے بیان کی ہے کہ پیشِ نظر مسئلے کی پوری نوعیت، نزاکت اور اہمیت اچھی طرح سمجھ لی جائے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے چند باتیں بخوبی واضح ہو جاتی ہیں:

اوّل یہ کہ یہودی آج تک اپنے منصوبوں میں اس بنا پر کامیاب ہوتے رہے ہیں کہ دنیا کی بڑی طاقتیں ان کی حامی و مددگار بنی رہی ہیں اور اُن کی اس روش میں آئندہ بھی کسی تغیر کے امکانات نظر نہیں آتے۔ خصوصاً امریکا کی پشت پناہی جب تک اسے حاصل ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے جُرم کے ارتکاب سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔

دوم یہ کہ اشتراکی بلاک سے کوئی امید وابستہ کرنا بالکل غلط ہے۔ وہ اسرائیل کا ہاتھ پکڑنے کے لیے قطعاً کوئی خطرہ مول نہ لے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ اس سے ہتھیار لے سکتے ہیں، اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ اشتراکیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالیں اور اسلام کو دیس نکالا دے دیں۔

سوم یہ کہ اقوامِ متحدہ ریزولیوشن پاس کرنے سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتی۔ اس میں یہ دم خم نہیں ہے کہ اسرائیل کو کسی مجرمانہ اقدام سے روک سکے۔

چہارم یہ کہ عرب ممالک کی طاقت اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ پچھلے ۲۲ سال کے تجربات نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے۔

ان حقائق کے سامنے آجانے کے بعد نہ صرف مسجد اقصیٰ، بلکہ مدینہ منورہ کو بھی آنے والے خطرات سے بچانے کی صرف ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طاقت، اس یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے اور اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کو مستقل طور پر محفوظ کر دینے کے لیے مجتمع کی جائے۔ اب تک یہ غلطی کی گئی ہے کہ فلسطین کے مسئلے کو ایک عرب مسئلہ بنائے رکھا گیا۔ دنیا کے مسلمان ایک مدت سے کہتے رہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کا مسئلہ ہے مگر بعض عرب لیڈروں کو اس پر اصرار رہا کہ نہیں، یہ محض ایک عرب مسئلہ ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب مسجد اقصیٰ کے سانحے سے ان کی آنکھیں بھی کھل گئی ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ صہیونیت کی عظیم بین الاقوامی سازش کا مقابلہ، جبکہ دنیا کی بڑی طاقتوں کی پوری تائید وحمایت بھی اس کو حاصل ہے، تنہا عربوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ دنیا میں اگر ایک کروڑ ڈیڑھ کروڑ یہودی ایک طاقت ہیں تو ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمان بھی ایک طاقت ہیں (یہ تازہ اعدادوشمار ۲۰۲۳ء میں جاری کیے گئے ہیں)، اور ان کی ۴۹ حکومتیں اس وقت انڈونیشیا سے مراکو اور مغربی افریقہ تک موجود ہیں۔ ان سب کے سربراہ اگر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور روئے زمین کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان ان کی پشت پر جان و مال کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائیں تو اس مسئلے کو حل کر لینا، ان شاء اللہ کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔

اس سلسلے میں جو عالمی کانفرنس بھی ہو اس کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اصل مسئلہ محض مسجد اقصیٰ کی حفاظت کا نہیں ہے۔ مسجد اقصیٰ محفوظ نہیں ہو سکتی جب تک بیت المقدس یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ اور خود بیت المقدس بھی محفوظ نہیں ہو سکتا جب تک یہودیوں کے غاصبانہ تسلط سے فلسطین پر یہودی قابض ہیں۔ اس لیے اصل مسئلہ تسلط سے آزاد کرانے کا ہے۔ اور اس کا سیدھا اور صاف حل یہ ہے کہ اعلان بالفور سے پہلے جو یہودی فلسطین میں آباد تھے صرف وہی وہاں رہنے کا حق رکھتے ہیں، باقی جتنے یہودی ۱۹۱۷ء کے بعد سے اب تک وہاں باہر سے آئے اور لائے گئے ہیں انہیں واپس جانا چاہیے۔ ان لوگوں نے سازش اور جبر ظلم کے ذریعہ سے ایک دوسری قوم کے وطن کو زبردستی اپنا قومی وطن بنایا، پھر اسے قومی ریاست میں تبدیل کیا، اور اس کے بعد توسیع کے جارحانہ منصوبے بنا کر آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا نہ صرف عملاً ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، بلکہ اپنی پارلیمنٹ کی پیشانی پر علانیہ یہ لکھ دیا کہ کس کس ملک کو وہ اپنی اس جارحیت کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔

ایسی کھلی جارح ریاست کا وجود بجائے خود ایک جرم اور بین الاقوامی امن کے لیے خطرہ ہے۔ اور عالمِ اسلامی کے لیے اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بنا پر خطرہ ہے کہ اس کے ان جارحانہ ارادوں کا ہدف مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ ہیں۔ اب اس ریاست کا وجود برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔

فلسطین کے اصل باشندوں کی ایک جمہوری ریاست بنی چاہیے جس میں ملک کے پرانے یہودی باشندوں کو بھی عرب مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرح شہری حقوق حاصل ہوں۔ اور باہر سے آئے ہوئے ان غاصبوں کو نکل جانا چاہیے جو زبردستی اس ملک کو قومی وطن اور پھر قومی ریاست بنانے کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس کے سوا فلسطین کے مسئلے کا کوئی حل نہیں ہے۔ رہا امریکا، جو اپنا ضمیر یہودیوں کے ہاتھ رہن رکھ کر، اور تمام اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ان غاصبوں کی حمایت کر رہا ہے، تو اب وقت آگیا ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان اس کو صاف صاف خبردار کر دیں کہ اس کی یہ روش اگر اسی طرح جاری رہی تو رُوئے زمین پر ایک مسلمان بھی وہ ایسا نہ پائے گا جس کے دل میں اُس کے لیے کوئی ادنی درجہ کا بھی جذبہ خیر سگالی باقی رہ جائے۔

اب وہ خود فیصلہ کر لے کہ اسے یہودیوں کی حمایت میں کہاں تک جانا ہے۔

غزہ سٹی: اسرائیل کا بڑا حملہ، حماس نشانہ

اسرائیل نے غزہ کی ساٹھ فیصد آبادی پر بڑے حملے کا آغاز غزہ سٹی کو نشانہ بنانے سے کر دیا ہے۔ قابض حکومت کے اکثر وزراء اور انسانیت کے مجرم نیتن یاہو اور بڑے جرنیلوں کی زبانیں زہر اگل رہی ہیں۔ حماس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ اس کا مرکز غزہ سٹی ہے۔ اسے نکال باہر کرنے کے لیے بہت بڑے حملے کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء کے منتشر مراکز تباہ کر دیے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ بھوک اور پیاس اس قدر شدید کر دی جائے کہ زیادہ تر ہلاکتیں اسی سے ہوجائیں۔

جنگی طیارے غزہ سٹی میں بالخصوص اور دیگر حصوں میں بالعموم ٹینٹ کمیونٹیز پر بمباری کر رہے ہیں۔ غزہ خوراک فاؤنڈیشن کے مراکز پر بھی حملے تیز کر دیے گئے ہیں۔ سنائپرز فائرنگ کر رہے ہیں۔ ان کی فائرنگ خوراک کے لیے آنے والوں اور خوراک لے کر جانے والوں دونوں طرح کے فلسطینیوں کو نشانہ بنا رہی ہے۔

غزہ کی وزارت صحت اموات کی تعداد نوٹ کر رہی ہے۔ اس کی وجہ قحط جیسی کیفیت مسلط کرنے اور بھوک و پیاس کو مسلح کرنے یعنی انہیں جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی غیر انسانی ذہنیت ہے۔ غزہ سٹی میں اس تازہ حملے کے پہلے دن مذکورہ وجوہات سے 271 افراد کی شہادت ہے۔ ان میں 112 بچے ہیں۔

غزہ سٹی پر حملوں میں شدت آ گئی ہے۔ دنیا تماشا دیکھ رہی ہے۔ مغرب تو مارنے والوں کا پشت پناہ ہے، عالم عرب مارنے والوں کو ہر طرح کی سپورٹ فراہم کر رہا ہے۔ ابتدائی طور پر دس لاکھ فلسطینیوں کو غزہ میں نشانہ بنانے اور انہیں بے گھر و بے در کرنے کے لیے قابض فوج، صہیونی ایجنٹ اور شین بیت مل کر شیطانی مثلث کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک بڑے پیمانے پر تباہ حال عمارتوں کو مزید تباہ کیا جارہا ہے تاکہ ان کے حصوں کو فلسطینی پرسکون خیال نہ کر سکیں اور انہیں کسی بھی صورت محفوظ خیال کر کے وہاں پناہ نہ لے سکیں۔

انروا (UNRWA) کے چیف فلپ لاریزینی نے اس صورت حال پر کہا ہے کہ سب سے پہلے بچے اس حملے کا براہ راست انشانہ بن رہے ہیں۔ انہوں نے خبردار کیا ہے کہ یہ سلسلہ دراز ہو رہا ہے۔ اب بچوں کو مارنے کی حکمت عملی اختیار کی جارہی ہے۔

ٹائمز آف اسرائیل نے ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ اس میں انروا چیف کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ ”غزہ کی آبادی بہت کمزور ہو چکی ہے۔ اسے 60 ہزار تازہ اسرائیلی ریزرو

فورس کے جدید ٹیکنالوجی سے لیس حملے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اب بہت بڑی تعداد میں اتنی ہمت نہیں رہی ہے کہ اسے جنوب سے شمال اور پھر شمال سے جنوب بے گھر اور بے دخل کر دیا جائے۔'' یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہے۔

انروا چیف کا مزید کہنا ہے کہ اس بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی منصوبہ اور اس پر عمل درآمد کی حکمت عملی ہونی چاہیے۔ منصوبہ نہ ہونے سے پہلا سانحہ بچوں کی اموات کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔ وہ جنیوا میں حاضرین سے خطاب کر رہے تھے۔

ٹائمز آف اسرائیل کی رپورٹ میں بھوک اور پیاس سے جاں بحق ہونے والے بچوں کی پہلے دن کی تعداد دو بتائی گئی ہے۔ اوپر ذکر ہوا ہے کہ اس انسانی بنائے گئے قحط سے 271 مارے گئے ہیں جن میں بچوں کی تعداد 112 ہے۔

جن دو بچوں کا ذکر ہوا، ان میں ایک یازن ابوفل ہے جس کی صحت خوراک دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے تباہ حال صحت سے موت تک خراب ہوئی۔ یہ بچہ اپنی ماں کے ہمراہ الشاطی پناہ گزین کیمپ میں تھا۔ یہ واقعہ 24 جولائی کو پیش آیا۔

پہلے دن کی شہادتوں کے بارے میں الجزیرہ عربیک نے بتایا کہ یہ 20 تھیں جو 24 گھنٹے پورے ہوتے 24 ہو گئی تھیں۔ یہ تعداد طبی ذرائع نے تصدیق کے بعد بتائی۔

اسی دن دیر ابلاح میں ٹینٹ کمیونٹی پر خوف ناک حملہ کیا گیا۔ یہ کیمپ بندرگاہ کے قریب واقع تھا۔ اس حملے کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق شہداء کی تعداد 20 تھی۔ ان میں امدادی کارکنوں کی تعداد 8 بتائی گئی ہے۔ اس حملے نے زیادہ تر ٹینٹ نذرِ آتش کر دیے تھے۔ اس حملے کی میڈیا نے ویڈیو بھی جاری کی جس میں دکھائی دے رہا تھا کہ ہر طرف آگ بھڑک رہی تھی۔ الجزیرہ کی حقائق جاننے کی ایجنسی سند (Sanad) کے مطابق یہ ٹینٹ دیر البلاح میں تھا۔

غزہ سٹی پر حملے کے بارے میں آنے والی اطلاعات میں وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کا مفصل انٹرویو بھی شامل ہے۔ اسے حملے کے سیاسی پہلو پر اسرائیل کا پہلا انٹرویو کہا جا سکتا ہے۔ یہ انٹرویو آسٹریلیا کے سکائی نیوز کو 21 اگست کو دیا گیا۔ اس انٹرویو میں آغاز ہی انتھونی البانیز وزیر آسٹریلیا پر حملے سے کیا۔ ان پر یہ الزام لگایا کہ جنگ بندی کی بات کرتے ہوئے البانیز نے ان دہشت گرد گروہوں (حماس کے القسام اور دیگر جہادی گروہوں) کی حمایت کی ہے جو اس وقت غزہ کے لیے لڑ رہے ہیں۔ دوسرا حملہ ان مغربی ممالک پر کیا جن کے اسلحہ اور گولہ بارود سے یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ نیتن یاہو نے البانیز پر حملہ کرتے ہوئے ان کی تعریف بھی کہ تا کہ تعلقات میں سرد مہری نہ آئے اور کہا:

''مجھے یقین ہے کہ وہ اچھی شہرت کے حامل کے راہ نما ہیں۔ لیکن اس وقت ان کا یہ ریکارڈ برباد ہو گیا جب انہوں نے جہادی تنظیموں کی حمایت کی۔'' ان کے انٹرویو میں تسلیم کیا گیا کہ گزشتہ کئی عشروں سے آسٹریلیا اسرائیل کا زبردست حامی رہا ہے۔ جب آسٹریلیا نے فلسطینی ریاست تسلیم کرنے کی بات کی۔ نیتن یاہو نے البانیز کی اس قدر مخالفت کی تا کہ فلسطینی ریاست تسلیم کرنے یا اس کا اعلان کرنے والوں کو کان ہو جائیں کہ ایسا کرنا بڑی خودکشی ہو گی۔

آسٹریلیا نے اس کا بھرپور جواب دینے میں تاخیر نہیں کی، وہاں کے ہوم افیئرز منسٹر ٹونی برک نے مسکت جواب دیتے ہوئے کہا کہ طاقت ہمارے پاس ہے، تم کس قدر لوگوں کو بھوک سے اڑا سکتے ہو یا کتنے زیادہ بچوں کو بھوک میں مبتلا کر سکتے ہو اور بس!

نیتن یاہو نے یہ انٹرویو اسرائیل کے ان ''محفوظ'' میڈیا ذرائع کو دیا جو ان سے ناپسندیدہ سوالات نہیں کر سکتے تھے۔ ان سے اسرائیل کے وزیر اعظم نے کہا۔۔۔ ''ہم یہ جنگ جیتنے والے ہیں۔''

نیتن یاہو جنگی کیفیت میں اس قدر مبتلا تھے کہ اگلی رات ہی وزیر اعظم آسٹریلیا کو ایکس (X) پر مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''تم ایک کمزور سیاستدان ہو جس نے اسرائیل کو دھوکہ دیا۔''

یہ ایک بڑے ملک کے ایسے لیڈر پر ذاتی حملہ تھا جس نے غزہ جنگ میں اسرائیل کا ساتھ اس کے باوجود نہیں چھوڑا۔ نیتن یاہو گزشتہ ڈیڑھ سال سے فتح کا اعلان کرتے رہے۔ فروری 2024ء میں انہوں نے کہا کہ رفاہ کے پاس جنوبی غزہ اب چند ہفتوں کی شدید جنگ کے ذریعے فتح ہونے کو ہے۔ پھر مئی اپریل میں بیان بدل لیا اور کہا کہ جنگ میں کامیابی اب صرف ایک قدر کے فاصلے پر (a Step away) ہے۔ پھر یوں ہوا کہ رفاہ میں شدید تصادم ہوا، یہ مئی 2024ء کا مہینہ تھا اور شکست ہی مقدر ٹھہری تھی۔

اسرائیل میں مرائے عامہ، دانش ور طبقات اور ابلاغیات سے وابستہ افراد 22 ماہ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ سیز فائر کی جائے، یرغمالی رہا کرائے جائیں جب کہ وزرائے حکومت بالخصوص سموٹریک، بن غفیر اور بزازیل کہہ رہے تھے کہ جنگ کے اختتام پر غزہ میں حکمت عملی پر انہیں اعتماد میں لیا جائے لیکن یہ سارے امور متنازعہ ہی چلے آ رہے تھے۔ اس بارے میں ٹائمز آف اسرائیل کی رپورٹس اور رائے بھی یہی آ رہی تھیں۔

ٹائمز آف اسرائیل نے رپورٹ دی تھی کہ نیتن یاہو نے 10 اگست کو مقبوضہ بیت المقدس

(یروشلم) میں پریس کانفرنس کی تھی۔ اس میں بھی وہ آسٹریلوی وزیراعظم انتھونی البانیز پر تنقید کی تھی۔ نیتن یاہو کا حالیہ انٹرویو اگست کے تیسرے ہفتہ کے اختتام اور چوتھے ہفتہ کے بالکل شروع میں شیری مارکسن نے کیا تھا۔ اس سے پہلے ایسی رپورٹس ٹائمز آف اسرائیل کے مطابق آرہی تھیں اور انہیں پاکستان کے چینلز بھی پیش کررہے تھے کہ حماس نے سیز فائر کی ایک امریکی تجویز منظور کرلی تھی۔ حماس نے تب یہ عندیہ دیا تھا کہ وہ اس تجویز کو قبول کرنے اور یرغمالیوں کو رہا کرنے پر تیار ہے، لیکن نیتن یاہو نے جواب دینے میں تین دن کی تاخیر کردی تھی اور سیز فائر سے انکار کردیا تھا۔ شیری نے دریافت کیا تھا کہ اسرائیل کا ردعمل کیا ہوگا؟

اس سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔ اسرائیلی کابینہ نے اعلان کردیا کہ وہ غزہ سٹی پر قبضہ کرے گی اور حماس کی مکمل تباہی تک حملہ جاری رکھا جائے گا۔ نیتن یاہو نے کہا تھا کہ یہ ہم آج ہی کرنے جارہے ہیں۔ ایسا کوئی سوال ہی نہ تھا کہ ہم حماس کو چھوڑ دیں گے۔ پھر یہ کہا کہ یہ جنگ آج ختم ہوسکتی ہے اگر حماس شکست مان لے اور ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کردے۔ یرغمالیوں کو رہا کردے۔ ان کی تعداد 50 ہے اور ان میں سے 20 زندہ ہیں۔ (یہ بات ذہن میں رہے کہ جس تعداد میں بھی یرغمالی مارے گئے، وہ اسرائیل کی بمباری سے مارے گے۔ حماس نے نہیں مارے)۔

نیتن یاہو نے غزہ میں حماس کے کردار پر سوال کا جواب دینے کے بجائے یہ کہا کہ ہم اسرائیل غزہ پر قبضہ کریں گے اور اسے ''حماس سے آزاد کرائیں گے۔'' غزہ کے لوگوں کو آزاد کرائیں گے۔

ہم نے ٹائمز آف اسرائیل سے نیتن یاہو کے انٹرویو کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ الجزیرہ ٹی وی کے تجزیہ نگار روورے چلانڈز (شیلانڈز) نے لکھا کہ غزہ سٹی پر قبضہ کا اعلان دراصل ایک سیاسی عمل کا نتیجہ ہے۔ اس میں اسرائیل کے لیے بھی اور خود نیتن یاہو کے لیے بڑے خطرات ہیں۔ انہوں نے کہا:

''یہ بنیادی طور پر ایک فوجی سیاسی آپریشن ہے۔ اس کا مطالبہ نیتن یاہو کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس کے جرنیل اس کے حق میں نہیں تھے۔ انہیں پیچھے کردیا گیا۔ یہ کہا گیا کہ یہ فوج کے لیے ایک جال یا پھندا ہے۔ دوسال کے آپریشن سے وہ تھک چکی ہے۔ اور اس بڑے حملے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہے۔

الجزیرہ کے تجزیہ کے مطابق نیتن یاہو نے فوج کے پلان کو تفصیل سے پڑھے بغیر یہ کہہ دیا کہ اس پر طے شدہ اہداف کو اس وقت سے پہلے مکمل کیا جائے جو فوج کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔

مبصرین کا کہنا ہے کہ اس ذہنیت کے ساتھ اس حملے میں جانا نہ صرف اسرائیل کو ناکام کردے گا بلکہ خود نیتن یاہو کو نقصان پہنچے گا۔ اس کی ناکامی کی سب سے پہلی یا بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ سیاسی عمل ہے، دوسال سے لڑتی فوج تھک چکی ہے۔ جن ریزروز فوجیوں کو طلب کیا جارہا ہے، وہ حاضر نہیں ہورہے یا ہونا نہیں چاہتے۔ یہ ایک کھلا حملہ ہے اور ریزروز اسے کامیاب بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس طرح سے نیتن یاہو فروری، اپریل اور مئی کے دعوؤں کی گرد میں مزید ناکامی کا اضافہ اور نسل کشی میں تیزی لائیں گے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اسرائیلی عوام اس بات کو جانتی ہے اور اسی لیے جنگ کے خلاف ہے۔

اسی نسل کشی کے لیے اسرائیل نے غزہ سٹی پر حملے کے پہلے دن سے غذائی امداد کے۔ سارے مراکز تباہ کردیے ہیں۔ یہ مراکز فلسطینیوں کے لیے کسی حد تک امداد پہنچا رہے تھے۔

فلسطین کی سول سوسائٹی کی تنظیمیں متعدد طرح کے حملوں کا شکار ہورہی ہیں۔ اس سلسلے میں فلسطینی این جی او نیٹ ورک کے ڈائریکٹر جنرل امجد شیوا کا کہنا ہے کہ قابض فوج نے ان کے نیٹ ورک کو 80 فیصد تک تباہ کردیا ہے، اس کے 230 امدادی کارکن ہلاک کردیے گئے ہیں، سینکڑوں دیگر ورکرز زخمی ہیں۔ یہ تنظیمیں شدید مالی بحران سے دوچار ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو فنڈز کی عالمی ترسیل ختم ہوچکی ہے۔ الخیر فاؤنڈیشن کے نمائندے محمد النجار کا کہنا ہے کہ غزہ خوراک فاؤنڈیشن سارے فنڈ لے گئی ہے اور ہمارے فنڈز روک کر اس فاؤنڈیشن کی طرف منتقل کیے جارہے ہیں۔

غزہ کی حکومت نے ٹیلی گرام کے ذریعہ دنیا کو خبردار کیا ہے کہ اس حملے کے پہلے تین دن غذائی امداد کے صرف 250 ٹرک آئے ہیں۔ اس سے قبل 600 ٹرک یومیہ یا ان تین دنوں میں 1800 ٹرک تھی۔

اسرائیلی فوج خوراک کے ضروری اجزاء بشمول انڈے، گوشت، مچھلی، دودھ اور ڈیری پراڈکٹس روک رہی ہے۔ سبزیاں، غذائی سپلیمنٹس آنے نہیں دیے جارہے۔ اس انسانی المیے کی ذمہ دار اسرائیلی فوج، امریکہ اور اس کے مغرب کے جملہ اتحادی ممالک ہیں۔ یہ سب اسرائیل کو مسلسل اسلحہ تو دے رہے ہیں، انسانی امداد نہیں دے رہے۔

غزا کے سول سوسائٹیز کے لوگ بھی اب کہہ رہے ہیں کہ اقوام متحدہ، عرب ممالک، مسلم دنیا اور بین الاقوامی برادری کو نوٹس لینا اور راست اقدام کرنا ہوگا۔

ذکر و فکر: محمد تقی عثمانی

ابراہیمی معاہدہ: پسِ پردہ حقائق اور نتائج

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام اس کے آخری پیغمبر پر جنھوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ صاحب آج کل ''ابراہیمی معاہدہ'' (Abrahamic Accords) کے نام سے ایک معاہدے کی زور وشور سے تبلیغ فرما رہے ہیں، جس کا اصل مطلب تو یہ تھا کہ مسلمان، یہودی اور عیسائی، تینوں چوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مقتدا مانتے ہیں، اس لیے ان کے درمیان باہمی تعاون ہونا چاہیے، لیکن آج کل یہ اصطلاح صرف ایک نقطے پر مرکوز ہے، اور وہ یہ ہے کہ مسلمان اور عرب حکومتیں اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کریں اور مشرق میں ابھرتی ہوئی سیاسی طاقت ''چین'' کے مقابلے میں امریکی بلاک کو مستحکم کر کے مسلمان اور عرب حکومتوں کو امریکہ کے حریف کے مدمقابل لا کھڑا کریں۔ چنانچہ اس معاہدے کے تحت متحدہ عرب امارات اور بحرین نے پہل کر کے اسرائیل کو نہ صرف تسلیم کیا، بل کہ اس کے تحت متعدد میدانوں میں دوستانہ تعلقات قائم کر لیے جن میں انٹیلی جنس کی معلومات کا تبادلہ بھی شامل ہے۔

یہ تو ''ابراہیمی معاہدہ'' کا آخری نتیجہ اور اس کا سیاسی پہلو ہے، لیکن اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے مدت سے زمین ہموار کی جا رہی ہے، چناں چہ علمی سطح پر یہ کوشش ہوتی رہی ہے کہ مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے۔ اگر یہ کوشش اس مقصد سے ہوتی کہ کسی بھی معاشرے میں جب ان تینوں مذاہب کے پیروکار موجود ہوں، تو وہ امن وامان کے ساتھ رہیں، اور مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے جان ومال پر حملے نہ کریں، تو اس حد تک بات کچھ غلط نہ ہوتی۔

لیکن اس کوشش کے دوران رفتہ رفتہ یہ تاثر دیا گیا کہ یہ تینوں مذاہب چوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مقتدا مانتے ہیں، اس لیے یہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اس کے لیے تو یہ اصول اپنانے کی کوشش کی گئی کہ اگر کسی ریاست میں متعدد مذاہت کے لوگ آباد ہیں، تو وہ اس ریاست کے شہری ہونے کے ناطے ''امت واحدہ'' ہیں۔

دوسرے ان تینوں مذاہب کے لیے ''ابراہیمی خاندان'' کی اصطلاح ایجاد کی گئی کہ مسلمان، یہودی اور نصرانی سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں، اور سب ابراہیم علیہ السلام کے پیرو ہیں، جس کا بالآخر نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ ان مذاہب میں حق وباطل کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہ سب حضرات ابراہیم علیہ السلام کے پیرو ہونے کی وجہ سے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو مذہب کی بنیاد پر اپنے سے الگ سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کا آخری نتیجہ یہی تھا کہ سارے ادیان برحق ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی نجات اخروی کے لیے لازمی نہیں ہے، یعنی وہی بات جو ''توحید ادیان'' کا عقیدہ رکھنے والے کہا کرتے ہیں۔ اور اور اب تو ''ابراہیمی معاہدہ'' اور ''اسرائیل کو جائز ریاست تسلیم کر کے اس سے تعلقات استوار کرنا'' دونوں ہم معنیٰ لفظ بن چکے ہیں۔

بعض اوقات بات چھوٹی سی یا دیکھنے میں معمولی ہوتی ہے، لیکن اس کے عواقب ونتائج بہت دور تک پہنچتے ہیں۔ عالم اسلام کی ایک نہایت قابل احترام اور بزرگ شخصیت حضرت شیخ عبداللہ بن محفوظ بن بیہ مدظلہم العالی اصلاً موریطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے وہاں کے مشائخ سے بڑا وسیع وعمیق علم حاصل کیا، اور اپنی فقہی بصیرت اور تجر علمی کے اعتبار سے دنیا کے گنے چنے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ میرا ان سے نیاز مندانہ تعلق اس وقت سے ہے جب سے وہ مجمع الفقہ الاسلامی میں بطور رکن تشریف لاتے تھے، اور میں ان کے تجر علمی سے استفادہ بھی کرتا تھا، اور بعض مسائل میں باہمی مذاکرہ اور خط وکتابت کا

سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ اس وقت وہ ایک خالص علمی شخصیت کے طور پر جانے جاتے تھے جن کا عملی سیاست سے کوئی قابل ذکر تعلق نہیں تھا۔

ایک عرصے کے بعد انہوں نے عالمی سطح پر ایک علمی ادارہ قائم کیا جو ''تعزیز السّلم'' یعنی ''امن کے فروغ'' کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ اس وقت مختلف مسلمان ممالک میں ''نفاذ شریعت'' کے نام پر مسلح بغاوتوں کا دور دورہ تھا۔ اور اس کی وجہ سے بہت سے بے گناہ مسلمانوں کا ناحق خون بہہ رہا تھا۔ اس لیے اس ماحول میں ''امن کے فروغ'' کی بات فی الجملہ ایک مستحسن بات تھی، اس مقصد کے تحت شیخ عبد اللہ بن بیہ حفظہ اللہ تعالیٰ نے کئی عالمی کانفرنسیں منعقد کیں جن میں راقم الحروف اور میرے برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک ہوئے، ایک ایسی ہی کانفرنس میں راقم الحروف نے اپنی تقریر میں اس طرف بھی متوجہ کرنے کی کوشش کی کہ جو لوگ مسلمان حکومتوں کے خلاف مسلح کارروائیاں کر رہے ہیں، اور ان کی وجہ سے بدامنی کے فتنے پیدا ہو رہے ہیں، اس کے جواب میں صرف کانفرنسیں منعقد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، بل کہ ضروری ہے کہ ایک طرف مسلمان ملکوں میں جو کام کھلم کھلا شریعت کے خلاف ہو رہے ہیں، ایک تو ان پر روک عائد کی جائے، تاکہ یہ مسلح بغاوتیں اس صورت حال کو اپنی کارروائیوں کا جواز بنا کر پیش نہ کر سکیں۔ دوسری طرف جو لوگ نادانی اور خلوص کے ساتھ ان تحریکوں کے ساتھ ہوئے ہیں، ان تک اس سلسلے میں قرآن و سنت کے صحیح احکام پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

بہر حال! اس موضوع پر متعدد کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ پھر ایک کانفرنس مراکش کے شہر میں بلائی گئی، جس کا موضوع یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں یہودیوں کے ساتھ جو معاہدہ فرمایا تھا اور جو ''میثاق مدینہ'' کے نام سے معروف ہے، مسلمان اس طرز کا ایک معاہدہ غیر مسلم شہریوں کے ساتھ کریں۔

جب بندہ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچا اور ''تعزیز السّلم'' (فروغ امن) کے ادارے کے ایک ذمہ دار جب استقبال کرنے کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''میثاق مدینہ'' میں ایک جملہ ایسا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں بسنے والے مسلمان اور یہودی دونوں ایک ہی ''امت'' ہیں، اس لیے اس کانفرنس کا مقصود یہ ہے کہ ہر مسلمان ملک میں اس تصور کو فروغ دیا جائے کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں ایک ملک کے باشندے ہونے کی بنا پر ایک ہی ''امت'' ہیں۔

یہ بات سن کر بندہ کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا، اور میں نے ''میثاقِ مدینہ'' کا غور سے مطالعہ کیا، اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ''میثاقِ مدینہ'' کی عبارت سے مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے ایک امت ہونے پر استدلال درست نہیں ہے۔

چنانچہ کانفرنس شروع ہونے سے پہلے میں شیخ عبد اللہ بن بیہ حفظہ اللہ تعالیٰ سے تنہائی میں ملا، اور ان سے عرض کیا کہ فلاں صاحب نے مجھ سے یہ بات کہی ہے، حالاں کہ ''میثاق مدینہ'' میں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ مسلمان اور یہودی مل کر ''امت واحدہ'' ہیں۔ میں نے ''میثاق مدینہ'' کی متعلقہ عبارت دکھا کر ان سے عرض کیا کہ یہ بات اس سے نہیں نکلتی۔ حضرت شیخ حفظ اللہ نے مجھ سے اتفاق فرمایا اور کہا کہ واقعی یہ بات درست ہے۔

اس کے بعد جب کانفرنس کی نشستیں شروع ہوئیں، اور بعض تقریروں میں یہ بات آئی کہ ایک ملک کے باشندے خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، سب مل کر ایک ''امت'' ہیں اور یہ میثاق مدینہ کا تقاضا ہے۔ تو ان پر تنقید کرتے ہوئے میں نے کھڑے ہو کر ''ھذہ امتکم امۃ واحدۃ'' اور دوسری قرآنی آیات کے حوالے سے عرض کیا کہ یہ قرآنی اصطلاح ایک دین کے پیروؤں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اور اسے ایک قومی حکومت (National State) کے لیے استعمال کرنے سے کئی معاملات میں خلطِ مبحث لازم آئے گا، اس لیے اس سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

لیکن جب کانفرنس کا اختتامی اجلاس ہوا جس میں ''اعلان مراکش'' کا اعلان ہونا تھا، اس وقت حضرت شیخ عبد اللہ بن بیہ حفظہ اللہ تعالیٰ میری نشست کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ دیر رکے اور مجھ سے فرمایا کہ ''میثاق مدینہ'' کی جس عبارت پر میری آپ سے بات ہوئی تھی، اس پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس سے قومی حکومت کے ''امۃ واحدۃ'' ہونے کا تصور نکل رہا ہے، اور یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس وقت وہ اتنی جلدی میں تھے کہ بات آگے بڑھانے کا موقع نہیں تھا، اور ''اعلان مراکش'' پڑھ کر سنا دیا گیا اور اس کے بعد کسی تقریر کا کوئی موقع نہیں تھا۔ جب وہ اعلان بعد میں میرے پاس دستخط کے لیے آیا تو میں نے اس پر اپنی تقریروں سے مشروط دستخط کیے اور اس طرح اس پر اختلافی نوٹ کا اشارہ دیا۔

اس کے بعد شیخ نے ایک اور کانفرنس بلائی اور اس میں ایک نئی اصطلاح کا تعارف کرایا گیا۔ وہ تھی ''ابراہیمی خاندان'' کی اصطلاح۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کسی ایک ملک میں مسلمان، عیسائی، یہودی اگر امن و امان کے معاہدے کے ساتھ رہیں تو اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ لیکن ان کو ''ابراہیمی خاندان'' سے تعبیر کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ سب واقعۃً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار ہیں، اور جو نسبت ابراہیم علیہ السلام سے مسلمانوں کو ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کو بھی وہی نسبت ہے۔ حالاں کہ قرآن کریم کے مطابق یہودی اور عیسائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین حنیف کو چھوڑ چکے، اور اب ان کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کوئی حقیقی تعلق نہیں رہا، قرآنی آیات کریمہ اس پر صریح ہیں، اس کے باوجود ان تینوں مذاہب کے پیشواؤں کو کانفرنس میں جمع کر کے انہیں ابراہیمی خاندان کہا گیا اور کانفرنس میں ہر ایک کی عبادت گاہ الگ بنائی گئی۔

اس موقع پر میں نے ضروری سمجھا کہ میں اس اصطلاح میں چھپے ہوئے مقاصد سے شیخ عبد اللہ بن بیہ حفظہ اللہ کو آگاہ کرنے کی کوشش کروں۔ مجھے ان کی حسن نیت پر شبہ نہیں تھا، لیکن میں سمجھتا تھا کہ بعض عاقبت نا اندیش لوگ ان کے ساتھ لگ کر انہیں اصطلاحات کے پھیر میں الجھا رہے ہیں، پھر ان سے کوئی اور مقاصد حاصل کریں گے، چنانچہ اس موقع پر میں نے انہیں ادب کے ساتھ ایک خط لکھا، اب تک میں نے وہ خط شائع نہیں کیا کیوں کہ یہ ایک نجی خط تھا، لیکن اب جب کہ ''ابراہیمی خاندان'' کی اصطلاح کے نتیجے میں امریکہ کے زیر اہتمام ۲۰۲۰ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کئی مسلمان حکومتوں کو ''ابراہیمی معاہدہ'' میں شامل کر لیا جن میں متحدہ عرب امارات اور بحرین سرفہرست تھے، اور اس معاہدے کا جزو اعظم یہ تھا کہ فلسطین کو تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے، اسرائیل کو تسلیم کر لیا جائے، اور اس کے ساتھ مختلف شعبوں میں تعاون اور اس کے ساتھ کام کرنے کے معاہدات کر لیے جائیں، اس وقت واضح ہوا کہ اس موضوع پر سیاسی کام جو کچھ بھی ہوا ہو، اس کو علمی امداد ان کانفرنسوں نے پہنچائی جن میں لوگوں کے ذہن کو قریب لانے کے لیے ''ایک امت'' اور ''ابراہیمی خاندان'' کی اصطلاحات قائم کر کے اس کی راہ ہموار کی گئی۔

اس لیے میں اب مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنا وہ خط شائع کر دوں جو میں نے اس خطرے کے پیش نظر حضرت عبد اللہ بن بیہ حفظہ اللہ کو بھیجا تھا، لیکن اس کا کوئی جواب موصول نہیں

ہوا۔ ذیل میں وہ خط پیش خدمت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم (۱)

الحمد للہ رب العالمین، والصلوۃ والسلام علی رسول الکریم وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین، وعلی کلّ من تبعھم بأحسان الی یوم الدین.

سماحۃ العلامۃ المحقق الداعیۃ الکبیر الشیخ عبد اللہ بن بیۃ حفظ اللہ تعالی وابقاہ ذخرا للا سلام والمسلمین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے آپ کی پرشفقت رفاقت اور عزت افزائی سے نوازا، جو مجھے آپ کی جانب سے ہر ملاقات میں حاصل ہوئی، خصوصاً جب سے میں نے آپ کو پہلی بار بین الاقوامی فقہ اکیڈمی کی نشستوں میں پایا، پھر مختلف علمی مجالس، سیمینارز اور خاص طور پر ''تعزیز السلم'' (فروغِ امن وسلامتی) کی کانفرنسوں میں، جن میں شرکت کی دعوت دے کر آپ نے مجھے عزت بخشی۔

میں آپ کی ان کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو آپ ظلم، جبر، جنگوں اور دہشت گردی سے بھری ہوئی اس دنیا میں امن کے قیام اور اس کے فروغ کے لیے انجام دے رہے ہیں اور جس کے لیے آپ عمر کے اس حصہ میں بھی کوشاں ہیں، جب عام آدمی راحت اور سکون کا متلاشی ہوتا ہے۔ فجزا کم اللہ احسن الجزاء۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قیام امن کے جس کام کے لیے آپ کوشاں ہیں، وہ ایک عظیم مقصد اور نہایت بلند ہدف ہے۔ تاہم، کچھ باتیں ایسی ہیں جو عرصے سے میرے دل میں کھٹک رہی تھیں، جنہیں کئی بار آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ کیا، لیکن یہ سوچ کر رک گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں لقمان کو حکمت سکھانے کی جسارت کر بیٹھوں یا ''مبضع تمر الی ھجر'' (''ہجر'' کو کھجور بھیجنے والی بات کا مصداق) بن جاؤں۔ مگر آج میں نے حسن نیت اور آپ کی شفقت وکرم نوازی پر اعتماد کرتے ہوئے، ان خیالات کو آپ کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

پہلی بات:

یہ حقیقت ہے کہ جو جنگیں اور دہشت گردی کی تحریکیں آج دنیا کو لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں، ان پر صرف کانفرنسوں اور سیمیناروں کے فیصلے کوئی خاص اثر نہیں ڈالتے، خاص طور پر ایسے وقت میں جب مسلمان فلسطین، کشمیر، بھارت، عراق، شام، برما، یمن اور دنیا کے دیگر حصوں میں بدترین مظالم اور انتقامی کارروائیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔

اگر آج ان کانفرنسوں پر ہونے والے اخراجات کو باہمی مسلم مصالحت، مظلوموں کی مدد اور بے سہارا انسانوں (خواہ کسی بھی مذہب سے ہوں) کی دادرسی پر صرف کیا جائے، یا ان بنیادی وجوہ کے خاتمے پر لگایا جائے جن کی وجہ سے دنیا میں پرتشدد تحریکیں پیدا ہوئیں، تو اس سے نسبتاً زیادہ مفید اور مؤثر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

دوسری بات:

اس میں شک نہیں کہ یہ کانفرنسیں کم از کم نظری اور عملی سطح پر مفید ضرور ہیں۔ لیکن ان کا مجموعی رخ دیکھا جائے، تو اکثر ان کا لب ولہجہ ایسا ہوتا ہے جیسے یہ مسلمانوں پر دہشتگردی اور عدم برداشت کے الزام لگانے والوں کے مقابلے میں، اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے ایک دفاعی مؤقف اختیار کر رہی ہوں، گویا دنیا میں صرف مسلمان ہی ہیں جو انسانی خاندان کے درمیان عدم برداشت اور تشدد کے بیج بوتے ہیں، اور انہی کی وجہ سے جنگیں بھڑکتی ہیں اور دہشت گردی کی تحریکات جنم لیتی ہیں۔

ہم دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے سامنے یہ ثابت کرنے میں لگے ہیں کہ ہم ایسے نہیں، بری الذمہ ہیں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ آج کی دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم، تشدد زدہ اور تعصب کا نشانہ بننے والی قوم مسلمان ہے۔

اس کے باوجود ہماری کانفرنسوں کی موضوعاتی ترجیحات میں زیادہ زور غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ رواداری اور ان کے حقوق کی بحالی پر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی دنیا میں کوئی غیر مسلم اقلیت ایسی ہے جسے اجتماعی طور پر ویسا ظلم وستم برداشت کرنا پڑتا ہو جیسا مسلمانوں کو روزانہ فلسطین، کشمیر، برما اور بھارت میں سہنا پڑتا ہے؟ کیا ان مظلوم مسلمانوں کے درمیان امن کا قیام زیادہ اہم ترجیح نہیں ہونا چاہیے؟

تیسری بات:

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان پرامن بقائے باہمی ایک اہم ضرورت ہے، اور ہمیں اس پر زور دینا چاہیے۔ لیکن کیا اس مقصد کے لیے ایسے الفاظ اور اصطلاحات اختیار کرنا ضروری ہے جو اس تاثر کو جنم دیں کہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سب ''ایک ہی قوم'' (امت واحدہ) ہیں، جیسا کہ ''مراکش'' کی غیر مسلم اقلیات سے متعلق منعقدہ کانفرنس میں یہ رویہ اختیار کیا گیا۔ حالاں کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو کفار سے الگ مستقل امت قرار دیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

۱) اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (الأنبیاء ۹۲)

ترجمہ: (لوگو) یقین رکھو کہ یہ (دین جس کی یہ تمام انبیاء دعوت دیتے رہے ہیں) تمہارا دین ہے جو ایک ہی دین ہے، اور میں تمہارا پروردگار ہوں۔ لہٰذا تم میری عبادت کرو۔

۲) وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ (المؤمنون: ۵۲)

ترجمہ: اور حقیقت یہ ہے کہ یہی تمہارا دین ہے (سب کے لیے) ایک ہی دین، اور میں تمہارا پروردگار ہوں، اس لیے دل میں (صرف) میرا رعب رکھو۔

۳) وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (یونس: ۱۹)

ترجمہ: اور (شروع میں) تمام انسان کسی اور دین کے نہیں صرف ایک ہی دین کے قائل تھے، پھر بعد میں وہ آپس میں اختلاف کر کے الگ الگ ہوئے۔ اور اگر تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو جس معاملے میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں، اس کا فیصلہ (دنیا ہی میں) کر دیا جاتا۔

۴) وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (النحل: ۹۳)

ترجمہ: اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت (یعنی ایک ہی دین کا پیرو) بنا دیتا، لیکن وہ جس کو چاہتا ہے (اس کی ضد کی وجہ سے) گمراہی میں ڈال دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے ہدایت تک پہنچا دیتا ہے۔

۵) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (ھود: ۱۱۸و۱۱۹)

ترجمہ: اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طریقے کا پیرو بنا دیتا، (مگر کسی کو زبردستی کسی دین پر مجبور کرنا حکمت کا تقاضا نہیں ہے، اس لیے انہیں اپنے اختیار سے

مختلف طریقے اپنانے کا موقع دیا گیا ہے) اور اب وہ ہمیشہ مختلف راستوں پر ہی رہیں گے۔ البتہ جن پر تمہارا پروردگار رحم فرمائے گا، ان کی بات اور ہے (کہ اللہ انہیں حق پر قائم رکھے گا) اور اسی (امتحان) کے لیے اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اور تمہارے رب کی وہ بات پوری ہوگی جو اس نے کہی تھی کہ: میں جہنم کو جنات اور انسانوں دونوں سے بھر دوں گا۔

۶) كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً- فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (البقرۃ: ۲۱۳)

ترجمہ: (شروع میں) سارے انسان ایک ہی دین کے پیرو تھے، پھر (جب ان میں اختلاف ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے جو (حق والوں کو) خوشخبری سناتے، اور (باطل والوں کو) ڈراتے تھے، اور ان کے ساتھ حق پر مشتمل کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں ان کا اختلاف تھا۔ اور (افسوس کی بات یہ ہے کہ) کسی اور نے نہیں بل کہ خود انہوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، روشن دلائل آجانے کے بعد بھی، صرف باہمی ضد کی وجہ سے اسی (کتاب) میں اختلاف نکال لیا، پھر جو لوگ ایمان لائے اللہ نے انہیں اپنے حکم سے حق کی ان باتوں میں راہ راست تک پہنچایا جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا، اور اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست تک پہنچا دیتا ہے۔

۷) وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (المائدۃ: ۴۸)

ترجمہ: اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن (الگ شریعتیں اس لیے دیں) تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔ لہٰذا نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تمہیں وہ باتیں بتائے گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔

۸) وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ وَ الظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ (الشوری: ۸)

ترجمہ: اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا، لیکن وہ جس کو چاہتا ہے، اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے، اور جو ظالم لوگ ہیں ان کا نہ کوئی رکھوالا ہے، نہ کوئی مددگار ہے۔

۹) وَ لَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ (الزخرف: ۳۳)

ترجمہ: اور اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تمام انسان ایک ہی طریقے کے (یعنی کافر) ہو جائیں گے تو جو لوگ خدائے رحمٰن کے منکر ہیں، ہم ان کے لیے ان گھروں کی چھتیں بھی چاندی کی بنا دیتے، اور وہ سیڑھیاں بھی جن پر وہ چڑھتے ہیں۔

۱۰) فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا (النساء: ۴۱)

ترجمہ: پھر (یہ لوگ سوچ رکھیں کہ) اس وقت (ان کا) کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے اور (اے پیغمبر) ہم تم کو ان لوگوں کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کریں گے؟

یہ آیات صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں ''ایک امت'' نہیں ہیں۔

جہاں تک ''میثاق مدینہ'' کا تعلق ہے، جسے ''اعلان مراکش'' نے اپنی بنیاد بنایا ہے، تو۔۔ اس کی عبارت مختلف مفاہیم کا احتمال رکھتی ہے۔

اسی طرح ''ابراہیمی خاندان'' (العائلة الابراهيمية) کی اصطلاح، جس میں مسلمان، عیسائی اور یہودی تینوں شامل کیے جاتے ہیں، متعدد مواقع پر استعمال کی گئی ہے، خاص طور پر حالیہ دنوں میں ابوظہبی کانفرنس سے جاری ہونے والے ''نئے حلف الفضول'' میں اس اصطلاح کو نمایاں طور پر اختیار کیا گیا۔ مگر یہ اصطلاح اس گمان کو جنم دیتی ہے کہ گویا یہ تمام ادویان (مذاہب) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں۔

حالاں کہ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ قرآن کریم کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

۱) وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (البقرۃ: ۱۳۵)

ترجمہ: اور یہ (یہودی اور عیسائی مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ: تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ راہ راست پر آجاؤ گے۔ کہہ دو کہ: نہیں بلکہ (ہم تو) ابراہیم کے دین کی پیروی کریں گے جو ٹھیک ٹھیک سیدھی راہ تھے، اور وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں۔

۲) اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرۃ: ۱۴۰)

ترجمہ: بھلا کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولادیں یہودی یا نصرانی تھیں؟ (مسلمانو! ان سے) کہو: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو ایسی شہادت کو چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے پہنچی ہو؟ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

۳) يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (آل عمران: ۶۵)

ترجمہ: اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں بحث کرتے ہو حالاں کہ تورات اور انجیل ان کے بعد ہی تو نازل ہوئی تھیں، کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے؟

۴) هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (آل عمران: ۶۶)

ترجمہ: دیکھو! یہ تم ہی تو ہو جنہوں نے معاملات میں اپنی سی بحث کر لی ہے جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا۔ اب ان معاملات میں کیوں بحث کرتے ہو جن کا تمہیں سرے سے کوئی علم ہی نہیں ہے؟ اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔

۵) مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران: ۶۷)

ترجمہ: ابراہیم نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، بل کہ وہ تو سیدھے سیدھے مسلمان تھے، اور شرک کرنے والوں میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔

۶) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَ بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (الممتحنة:۴)

ترجمہ: تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ہمارا تم سے اور اللہ کے سوا تم جن جن کی عبادت کرتے ہو، ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے جب تک تم صرف ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔

یہ محض الفاظ کی بحث نہیں ہے۔ جب ''وحدت امت'' یا ''ابراہیمی خاندان'' جیسی اصطلاحات ایسی شکل میں استعمال کی جاتی ہیں کہ ان میں مسلمانوں کے ساتھ دیگر مذاہب والے بھی شامل ہو جائیں، تو یہ بات ان لوگوں کے لیے تقویت کا ذریعہ بن سکتی ہے، یا کم از کم ان کے لیے غلط استعمال کا موقع بن سکتی ہے، جو ''وحدت ادویان'' کے نظریے کو مانتے ہیں، یعنی (جو کہتے ہیں) کہ تمام مذاہب برحق ہیں، ان کے درمیان حق و باطل کا کوئی فرق نہیں، اور نجات صرف اسلام میں منحصر نہیں۔

اسی طرح ان اصطلاحات کا استعمال ''قومی ریاست'' (National State) کے تصور کو بھی تقویت دیتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ ریاست کی بنیاد قومیت پر ہو، نہ کہ مذہب پر۔ اس تصور میں خالص اسلامی ریاست کی کوئی گنجائش نہیں، بل کہ سیکولر ازم (یعنی لامذہبی اصول) ہی قومی ریاست کا بنیادی ڈھانچہ ہوتا ہے۔

اس خطرے کو مزید تقویت اس بات سے ملتی ہے جو ''اعلان مراکش'' کی تصویری دستاویز میں لکھی گئی ہے:

''جدید تہذیبی سیاق میں صحیفۂ مدینہ، مسلمانوں کے لیے شہریت کا ایک مستند ماڈل پیش کرتا ہے۔ یہ ماڈل اسلامی ممالک میں اقلیتوں کے حالات کے لیے موزوں ہے۔ یہ معاہدہ تاریخی اعتبار سے نیا ضرور ہے، مگر اسلامی تجربے میں گہرائی سے جڑا ہوا ہے۔ اس میں انفرادی تشخص کا احترام کیا جاتا ہے، اقلیتوں کو اپنے دین پر عمل کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے، اور سب لوگ مل کر دنیاوی معاملات کو باہمی ہم آہنگی سے چلاتے ہیں، ایسی ذمہ داریوں اور حقوق کی بنیاد پر جو عقلی دستور، کے ذریعے متعین کیے گئے ہوں، جو توازن، خوشگوار بقائے باہمی، قانون کی حکمرانی، اور سیاسی اختلافات کے منصفانہ حل کو یقینی بناتا ہے۔''

یہاں خاص طور پر ''عقلی دستور (rational constitution)'' کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی اسلامی ممالک کے سیاق میں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا مطلب ''سیکولر دستور'' ہی ہے؟ اور سوال یہ ہے کہ جب سب لوگ مل کر دنیاوی معاملات چلا سکتے ہیں تو وہ ''اسلامی دستور'' کی روشنی میں ایسا کیوں نہ کریں؟ پھر کیوں ''عقلی'' یا ''سیکولر'' دستور کی بات کی گئی؟

میں ایک بار پھر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان پرامن بقائے باہمی ایک عظیم مقصد اور شاندار نصب العین ہے، جس کا انکار صرف کوئی ضدی اور تنگ نظر شخص ہی کر سکتا ہے۔ مگر یہ بقائے باہمی ایسے حدود کے دائرہ میں رہ کر ہونی چاہیے جو معقول ہوں، ایسا نہ ہو کہ کہیں اس کی وجہ سے مذاہب کے درمیان فرق ہی مٹ جائے اور عقائد کے بنیادی اختلافات نظر انداز ہو جائیں، جس کے نتیجے میں حق و باطل خلط ملط ہو جائیں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ ایسی اصطلاحات اور ان پر اس قدر زور دینے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ رفتہ رفتہ ہم ''وحدت ادیان'' یا ''قومی ریاست'' یا ''سیکولرازم'' کے نظریے کو قبول کرنے لگیں، اور یوں بارش سے بچنے کی کوشش میں ہم پرنالے کے نیچے جا بیٹھیں۔

یہ چند عاجزانہ گزارشات ہیں جو میں نے آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں، اس امید پر کہ آپ ان پر توجہ فرمائیں گے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں میں اپنی حد سے تجاوز نہ کر گیا ہوں، مگر آپ کی ہمیشہ کی شفقت نے مجھے ہمت دی کہ یہ باتیں آپ کے سامنے رکھ سکوں۔ اگر کوئی بات دل کو ناگوار گزری ہو تو مجھے معاف فرما دیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے، آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ دراز عمر عطا فرمائے، اور ہم سب کو اپنی رضا کے راستے پر چلنے کی توفیق دے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا قدرداں

محمد تقی عثمانی

[ا) یہ اصل عربی خط کا اردو ترجمہ ہے۔ جو مولانا عبد الوہاب دیروی صاحب استاذ دارالعلوم نے کیا۔ اصل خط سہ ماہی ابلاغ عربی کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔]

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ ان کانفرنسوں میں نئی اصطلاحات متعارف کروا کر پہلے علمی سطح پر ''ابراہیمی معاہدے'' کے لیے فضا ہموار کرنے کی کوشش ہوئی، اور ۲۰۲۰ء میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی سربراہی میں ''ابراہیمی معاہدہ'' وجود میں آ گیا جو متعدد ایگریمنٹس پر مشتمل ہے، جن میں معاہدے میں شامل ممالک (بشمول اسرائیل) کے ساتھ تجارتی، تزویراتی اشتراک کے احکام موجود ہیں، اور اب اگر آپ ''ابراہیمی معاہدے'' کا لفظ گوگل میں ڈال کر یا وکی پیڈیا میں دیکھیں تو اس کا واحد مطلب یہ لکھا ہوا ہو گا کہ معاہدے میں شامل تمام ممالک اسرائیل کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ معمول کے تعلقات بحال کریں۔ نتیجہ یہ کہ مزعومہ (ابراہیمی خاندان'' کا صرف ایک ملک یعنی اسرائیل اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی حیثیت منوائے جو اس نے دھوکے، فریب اور معصوموں کے قتل عام کی بنیاد پر قائم کی ہے، اور اسی ''ابراہیمی خاندان'' کے وہ لوگ جو فلسطین کے اصل باشندے ہیں ان کا معاملہ کم از کم اس وقت تک معلق رکھا جائے جب تک اسرائیل چاہے۔

اس معاہدے پر کئی عرب ممالک متحدہ عرب امارات، بحرین، مراکش اور سوڈان نے دستخط کیے ہیں۔ سعودی عرب نے دستخط نہیں کیے اور یہ منصفانہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ جب تک بیت المقدس کو دارالحکومت بنا کر فلسطین کی ریاست قائم نہ ہو، وہ اس معاہدے میں شریک نہیں ہو گا۔

اب آپ تصور فرمائیے کہ ''ابراہیمی خاندان'' کی اصطلاح سے کس طرح صرف ایک ایسی ناجائز ریاست کو تحفظ دیا جا رہا ہے جو ایک وحشی درندے کی طرح کبھی فلسطین کے باشندوں کا قتل عام کرتی ہے، کبھی ایران پر، کبھی لبنان پر اور کبھی شام پر بے خوف و خطر چڑھ دوڑتی ہے، اور جسے نہ کسی بین الاقوامی قانون کا پاس ہے، نہ اخلاقی روایات کا، نہ کسی معاہدے کی پابندی اس کی لغت میں کوئی معنی رکھتی ہے۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ ''امن'' کے پرفریب نعرے کے ساتھ اس معاہدے کی طرف مسلمان ملکوں کو دعوت دے رہے ہیں، تاکہ سارے مسلمانوں کو اسرائیل کی خواہشات کا غلام بنا کر انہیں اپنے حریف ''چین'' کے مدمقابل کھڑا کر دیں۔

ترے نشتر کی زد شریانِ قیس ناتواں تک ہے

مغربی کنارے کے دیہی علاقے آباد کاروں کے نشانے پر

اسرائیل بڑی سُرعت سے مغربی کنارہ اپنے ناجائز وجود کے اندر ضم کر رہا ہے۔ فلسطینی تباہ کیے جا رہے ہیں، ان کی معاشرتی زندگی برباد کی جا رہی ہے۔ مغربی کنارہ سے فلسطینی بدُو بے دخل کیے جانے کی پرتشدد پالیسی کے علاوہ اس مقبوضہ عرب کلچر سے شہریت، گھروں کو نذرِ آتش، گلیوں، محلوں کو بلڈوز کیا جا رہا ہے۔ مویشیوں کے چارے کے لیے کھیت ختم کیے جا رہے ہیں، پانی کے ذخیروں کو زہریلا کیا جا رہا ہے تاکہ ان سے نہ انسان اور نہ حیوان پانی لے سکیں پی سکیں۔

اس خطے میں یہودی نوآبادیات (Settlers) کی جانب سے تشدد اور لوٹ مار کے واقعات اسرائیل کے ایجنٹوں، فوج اور پولیس کی سرپرستی میں جاری ہیں۔ 19 اپریل کو اس سال یہ تشدد اس وقت عام دیکھا گیا جب ان یہودی، صیہونی درآمد شدہ نوآبادیات نے راس عین العوجا میں مسلح ہو کر حملہ کیا۔ راس عین العوجا جریکو کے شمال میں مختصر سا گاؤں ہے جس کی آبادی 550 فلسطینی بدوّوں پر مشتمل تھی۔ ان آباد کاروں نے گھروں پر مسلح حملہ کیا، البیدار آرگنائزیشن فار دی ڈیفنس آف بدوین رائٹس کے کوآرڈی نیٹر حسن ملیحت نے صحافیوں کو بتایا کہ مختلف گروہوں کی صورت میں بڑی تعداد میں آباد کاروں نے راس العوجا پر یلغار کی۔ ان کے ہمراہ بہت بڑی تعداد میں مویشی تھے جن میں بکرے، بکریاں وغیرہ شامل تھیں۔ ان کے ذریعے فلسطینی کھیتوں کو تباہ کیا گیا۔

جب اپنی فصلوں کو بچانے کے لیے فلسطینی سامنے آئے تو ان پر حملہ کر دیا گیا۔ خیر بت الدیر میں پانی کے ذخیرے تباہ کر دیے۔ فصلوں کو تباہ کر دیا، ان کو آتشیں مادہ چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ یاد رہے کہ یہ وادئ اردن ہے، مقبوضہ مغربی کنارے کا حصہ ہے۔

غزہ پر اسرائیل کے حملے سے لے کر 2024ء کے جنوری کے مہینے تک اس خطے میں 51 فلسطینی شہید کر دیے گئے۔ 2024ء کے آخر تک یہاں سے 29 گاؤں تباہ کر دیے گئے۔ ان سب میں فلسطینی خاندان آباد تھے۔ یہاں سے 311 خاندان اور ان کے 2 ہزار سے زیادہ مکین نقل مکانی پر مجبور کر دیے گئے۔ اس عرصے میں مغربی کنارے میں شدید لوٹ مار، دباؤ، گرفتاریاں اور فلسطینیوں کا اغواء جاری رکھا گیا۔ اس شدید لوٹ مار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس دوران میں 952 فلسطینی شہید کر دیے گئے۔ دنیا نے ان واقعات کا نوٹس بھی نہیں لیا۔ سات ہزار فلسطینی زخمی ہوئے۔

جولائی 2024ء میں بین الاقوامی عدالت برائے انسداد جرائم نے قرار دیا کہ اسرائیل کا مغربی کنارے پر قبضہ، مشرقی بیت المقدس میں یہودی آباد کاری اور بستیوں کا قیام بین الاقوامی قانون کی سنگین پامالی ہے، ان علاقوں کو فی الفور خالی کیا جائے۔

جب جنوری 2024ء میں اسرائیل نے سیز فائر معاہدہ ہوا میں اڑا دیا، اس کے بعد سے اب تک 4 لاکھ 20 ہزار فلسطینی غزہ سے بے گھر اور بے دخل کیے جا چکے ہیں۔ یہ اعداد و شمار انروا (UNRWA) کے ہیں۔

اسرائیل کی حقوق انسانی کی تنظیم B'Tselem کے مطابق سوموار یکم اپریل 2024ء کو ایک یہودی آباد کار اپنے 100 کے قریب مویشیوں کے ساتھ سلیمان زید کے ملکیتی کھیتوں میں گھس آیا۔ یہ کھیت راس العوجا کی آبادی سے صرف 100 میٹر دور تھے۔ ان مویشیوں نے کھڑی فصل تباہ کر دی۔ جب اس کی اطلاع پولیس کو دی گئی تو اس کے افسران اس قدر تاخیر سے موقع واردات پر پہنچے جب یہودی آباد کار وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔ ان افسران نے گاؤں کے رہائشیوں سے سرسری سی ملاقات کی اور کچھ کیے بناء وہاں سے واپس روانہ ہو گئے۔ یہی آباد کار 6 اپریل کو دوبارہ حملہ آور ہوئے۔ اس بار یہ رات 8 بجے حملہ آور ہوئے۔ بچے کچھے کھیتوں میں پھر مویشی چھوڑ دیے۔ اس مرتبہ پھر انہوں نے سلیمان زید کے ہی کھیتوں پر حملہ کیا۔ تیسری بار یہی آباد کار پھر آئے اور اس مرتبہ ان کے ساتھ پہلے سے بڑی زیادہ تعداد میں مویشی تھے۔ اس مرتبہ رہائشیوں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔

اس طرح مغربی کنارے کے بالخصوص دیہی علاقوں میں یہودی نوآبادیات کار فلسطینیوں کو ان کے گھروں، زرعی زمینوں اور باغوں سے محروم کر رہے ہیں۔ طریقہ کار یکساں ہے، پہلے آبادکار یہودی حملہ کرتے ہیں، مویشیوں کے ساتھ کھڑی فصلیں تباہ کرتے ہیں، جب فلسطینی سامنے آتے ہیں تو ان پر حملہ آور ہوتے ہیں، ان کی مدد اور پشت پناہی اسرائیلی پولیس کرتی ہے، پھر فوج شامل ہو جاتی ہے۔ یہ مل کر رہائشی فلسطینیوں کو ان کے پورے خاندان سمیت بے دخل کرتی ہے، کچھ گھروں کو نذر آتش اور کچھ کو بلڈوز کرتی ہے۔

نارویجن ریفیوجی کونسل (NRC) نے جولائی 2025ء کے شروع دنوں میں اسرائیل کو وارننگ دی کہ مشرقی معراجات سے فلسطینی خاندانوں کو تشدد اور مار پیٹ سے بے دخل کیا گیا، ان کے گھر برباد کر دیے گئے، یہی واردات راس العوجا میں دھرائی گئی، بار بار آبادکاروں نے حملے کیے، اسرائیلی قابض پولیس نے ان کا ساتھ دیا، قابض فوج نے اپنی نگرانی میں یہ سب کچھ بلا روک ٹوک کرایا، پانی کے کنویں تباہ اور زہر آلود کر دیے گئے، مویشی بار بار داخل کر کے کھڑی فصلیں تباہ کر دی گئیں۔

یہ کوئی ایسے واقعات نہ تھے جو ریاستی لاعلمی میں ہوتے رہے۔ یہ زبردستی اور ریاستی قوت سے مسلط کیے گئے واقعات تھے۔ ان کا طریقہ کار ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ ان کے ساتھ جگہ جگہ ناجائز چیک پوسٹیں بنائی گئیں۔ آہنی دیواریں کھڑی کی گئیں تاکہ متاثرہ دیہات کی بیرونی دنیا تک رسائی ناممکن بنا دی جائے، پھر فلسطینی عوام کو مارا اور قتل کیا جائے۔ اس طرح ان علاقوں کو رہنے اور فلسطینیوں کی رہائش کے قابل نہ رہنے دیا جائے۔ اس طرح سے رہائشیوں کی بے دخلی دراصل جبری منتقلی ہے۔ اسی طرح سے نسلی خاتمے کا عمل (Genocide) مکمل کیا جا رہا ہے۔ یہ بین الاقوامی قانون کی سنگین پامالی ہے۔

این آر سی کے مڈل ایسٹ اور نارتھ افریقہ (MENA) کی ریجنل ڈائریکٹر اینجلیٹا کیریڈا (Anglitta Cardda) نے کہا کہ۔۔۔ ''ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسرائیل تشدد، قبضے اور مار پیٹ سے فلسطینیوں کو ان کے گھروں، فصلوں، کاروباروں اور علاقوں سے بے دخل کرتا جا رہا ہے۔ ایک ایسی فضا بنا دی گئی ہے جس میں فلسطینی خاندانوں کا رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔۔۔'' اینجلیٹا بھی جانتی ہیں کہ یہ سلسلہ قائم ہے اور اس گھٹی گھٹی فضا میں سانس لینا بھی ممکن نہیں ہے۔ دنیا کو اس صورت حال کا نوٹس لینا چاہیے۔

راس عین العوجا میں جو کچھ ہوا، اس کی شدت یہ بھی ہے کہ عالمی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق اس طرح کے اسی گاؤں پر 50 سے زیادہ حملے ہو چکے ہیں۔ اس علاقے کی قریب ترین فوجی پوسٹ بھی صرف 400 میٹر پر قائم کی گئی ہے۔ پولیس پوسٹ 100 میٹر پر ہے اور صرف حملہ آوروں کو سپورٹ کرتی ہے۔

اوپر معرجات کا ذکر ہوا، اس علاقے پر بھی اسی تعداد اور شدت سے حملے جاری ہیں۔ فلسطینی کسی بھی صورت میں بے دخل ہونے کے باوجود اپنے علاقے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی کمیونٹی کے سکول سے 100 میٹر فاصلے پر پوسٹ سے بچوں پر حملے ہوتے ہیں، سکول جاتے اور واپس آتے بچوں کو ہراساں کیا جاتا ہے۔ انہیں کئی کئی گھنٹے زبردستی پوسٹ پر روک لیا جاتا ہے۔

یہاں کے رہائشی خاندانوں کا کہنا ہے کہ انہیں برسوں سے اس صورت حال کا سامنا ہے۔ آبادکاروں کے چھاپے اور حملے ان کے لیے یونہی ہیں جیسے گھر سے نکلتے ہی کوئی چور یا ڈاکو ان پر دھاوا بول دے۔ وہ ہمارے بچوں پر حملے کرتے ہیں، ہمارے گھروں سے سامان لوٹ کر لے جاتے ہیں۔ سلیمان ملیحت کا کہنا ہے کہ صورت حال تب زیادہ خراب ہو جاتی ہے جب یہ آبادکار اس قدر دیدہ دلیری پر اتر آتے ہیں کہ فوج اور پولیس کی طرح پوسٹ قائم کر لیتے ہیں۔ پولیس ان کی نگرانی اور پشت پناہی کرتی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ جب ہم اپنا دفاع کرتے ہیں، ہمیں ہی گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ انہی دنوں میں جولائی سے اب تک ام الجمال اور مخیر الدائر میں یہی کچھ ہو رہا ہے، ان چند دیہات سے 29 سو فلسطینی بے دخل کیے جا چکے ہیں۔

عالمی اداروں کے مغربی کنارے بارے رپورٹوں سے درج ذیل نکات نوٹ کرنے کے ہیں:

» اقوام متحدہ کے ادارے (OCHA) کے اعداد و شمار کے مطابق جنوری 2023ء سے اب تک 2894 فلسطینی ان کے گھروں، خاندانوں اور آبادیوں سے بے دخل کیے جا چکے ہیں۔ ان میں سے 2023 میں 1,60، 2024ء میں 621 اور 2025ء میں اب تک 635 فلسطینی نکال جا چکے ہیں۔

» اسی ادارے کے مطابق راس عین العوجا سے 111 ہاؤس ہولڈ کے 550 فلسطینی بے دخل کیے گئے ہیں۔

» اقوام متحدہ نے جنوری 2025ء سے اب تک راس عین العوجا کے گھروں پر 59 حملے ریکارڈ کیے گئے ہیں۔

» اقوام متحدہ کے ہی مطابق یکم جنوری سے 30 جون تک آبادکاروں کے حملوں میں 740 واقعات ہلاکتوں، افراد کے زخمی ہونے، جائیداد کی لوٹ مار اور تباہی وغیرہ کی صورت میں ہوئے ہیں۔

» اسرائیل مغربی کنارے پر قابض قوت کی وجہ سے بین الاقوامی قانون کے تحت زیر قبضہ آبادی کو زبردستی ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل نہیں کر سکتا۔ اس وقت سے مراد صرف عملی قوت نہیں ہے۔ اس میں زبردستی، تنگ کرنے کے حربوں، دھونس دھمکیوں، تشدد کے ڈر اور خوف پھیلانے، دباؤ، نفسیاتی اثرات یا طاقت کے کسی بھی ناجائز استعمال سے بھی یہ منتقلی نہیں کی جا سکتی۔ اسرائیل یہ سارے حربے اور ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔

» بین الاقوامی قانون کے تحت آبادیوں میں، ان کے اردگرد یا یا پاس آؤٹ پوسٹ، چیک پوسٹ یا آبادی (Settlement) تعمیر نہیں کر سکتا۔ اسرائیل نے ایسے کاموں کی رفتار بڑھا دی ہے۔

» اسرائیل ان تمام حربوں اور ہتھکنڈوں کے استعمال کے برعکس متاثرہ دیہات کی بہتری کا ذمہ دار ہے، وہ اپنی ذمہ داری سرے سے ادا نہیں کر رہا۔

» ان متذکرہ نکات کے علاوہ بھی عمومی طور پر فلسطینی زندگی شدید خطرات سے بالخصوص مغربی کنارے اور مقبوضہ مشرقی بیت المقدس میں دوچار ہے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت اسرائیل جنگی جرائم کر رہا ہے۔ عالمی اداروں عالم عرب اور عالم اسلام کی بے بسی حالات کو اور بھی خراب کر رہی ہے۔ مفادات کی اس دوڑ کو ختم ہونا چاہیے۔ ایسے کسی سافٹ امیج کی عالم عرب یا عالم اسلام کو ضرورت نہیں ہے جس کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے۔

[احمد بیرم اور این آر سی گلوبل میڈیا رپورٹ]

براہ راست رپورٹ: ثامل بل

کولمبیا کے صدر تیری غیرت کو سلام

غزہ نے تمام اقوام اور ممالک کی غیرت کو جگا دیا سوائے مسلم ممالک کے

کولمبیا کے صدر گوستاوو پیٹرو نے ایک غیر معمولی اور جرات مندانہ قدم اٹھاتے ہوئے ملکی بحری افواج کو عسکری حکم جاری کیا ہے کہ کولمبیا کی بندرگاہوں سے اسرائیل کی جانب کوئلہ لے جانے والے کسی بھی بحری جہاز کو گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ صدر نے کہا کہ میں افواج کے سپریم کمانڈر ہونے کے ناطے اس اقدام کی ساری ذمہ داری اٹھاتا ہوں۔

صدر پیٹرو نے اپنے سرکاری بیان میں کہا:

''ہم نسل کشی میں شریک نہیں ہوں گے۔ اسرائیل نے غزہ میں جو مظالم کیے ہیں، ہم ان کے سامنے خاموش تماشائی نہیں بن سکتے۔ یہ ایک انسانی فریضہ ہے کہ ہم اپنی خاموشی اور تجارت کے ذریعے کسی ظلم کا حصہ نہ بنیں۔''

کولمبیا، جو دنیا کے اہم کوئلہ برآمد کرنے والے ممالک میں شامل ہے، اسرائیل کو توانائی کے لیے استعمال ہونے والے کوئلے کی فراہمی کرتا رہا ہے۔ لیکن اب جب کہ اسرائیل نے غزہ پر کئی ماہ سے مسلسل بمباری جاری رکھی ہوئی ہے، ہزاروں فلسطینی شہری بشمول خواتین اور بچے شہید ہو چکے ہیں، پیٹرو حکومت نے واضح موقف اختیار کرتے ہوئے اسرائیل کو کوئلہ سپلائی روکنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ اقدام اس بڑے فیصلے کی کڑی ہے جو کچھ ماہ قبل کیا گیا، جب کولمبیا نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات منقطع کر دیئے تھے۔ اس وقت بھی صدر پیٹرو نے غزہ پر حملوں کو "نسل کشی" قرار دیا تھا اور اقوام متحدہ سے اسرائیل کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا تھا۔

کولمبیا کا یہ فیصلہ ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب عالمی برادری میں اسرائیل کے خلاف بڑھتی ہوئی ناپسندیدگی دیکھی جا رہی ہے۔

جنوبی افریقہ، بولیویا اور برازیل جیسے ممالک پہلے ہی اسرائیلی اقدامات کی شدید مخالفت کر چکے ہیں۔ اب کولمبیا کی جانب سے براہِ راست معاشی دباؤ ڈالنے کا یہ اقدام، اسرائیل کے لیے خطرے کی گھنٹی تصور کیا جا رہا ہے۔

کولمبیا کا یہ فیصلہ محض ایک معاشی قدم نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور انسانی موقف کی علامت ہے۔ جب اقوامِ متحدہ جیسے ادارے اسرائیل کے خلاف مؤثر اقدامات میں ناکام ہو رہے ہیں، تب ایک لاطینی امریکی ملک کی جانب سے ایسا اقدام عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے مترادف ہے۔

صدر پیٹرو کا اقدام نہ صرف فلسطینی عوام کے ساتھ یکجہتی کا اظہار ہے بلکہ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ضمیر ابھی زندہ ہیں۔ اسرائیل کے ساتھ تجارتی و عسکری تعلقات رکھنے والے مسلم اور غیر مسلم ممالک کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ ایک غیر مسلم، جمہوری ملک اپنے معاشی مفادات کو پسِ پشت ڈال کر ظلم کے خلاف کھڑا ہو سکتا ہے، تو باقی دنیا کیوں نہیں؟

یہ اقدام ممکن ہے کہ کولمبیا کو اقتصادی طور پر کچھ وقتی نقصان دے، مگر اخلاقی تاریخ میں اس کا یہ فیصلہ ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

اس لئے میں ایک بار پھر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تمام مسلم ممالک کے سارے حکمرانوں سے صدر پیٹرو کا ایک بال بھی بہتر ہے۔

روشن چراغ: ضیاء چترالی

دور صحابہ کا آدمی، حکم العیسیٰ ابو عمر السوری

گزشتہ دنوں شہداء کی سرزمین فلسطین اور غازیوں کے غزہ سے ایک ایسا مردِ مجاہد رخصت ہوا جس کا اصل نام بھی بہت سوں کو معلوم نہ تھا، مگر اس کا ذکر رہتی دنیا تک اہلِ عزیمت کے دلوں کو گرماتا رکھے گا۔ وہ گمنامی میں جیا اور شہادت تک گمنام ہی رہا۔ گزشتہ دنوں جب دجالی فوج نے غزہ کے علاقے صبرہ پر بمباری کے بعد اعلان کیا کہ انہوں نے ''ابو عمر السوری'' کو نشانہ بنایا ہے، تو شاید دنیا کی اکثریت کے لیے یہ نام اجنبی ہو۔ نہ کسی ٹی وی اسکرین پر ان کا چہرہ کبھی دکھائی دیا، نہ کسی انٹرویو میں آواز سنائی دی، نہ ہی وہ کبھی کسی فوجی پریڈ یا شہرت کے ہالے میں نمودار ہوئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ''ابو عمر السوری'' جن کا اصل نام حکم العیسیٰ تھا، غزہ کی مزاحمت کی عسکری ریڑھ کی ہڈی تھے، وہ دماغ تھے جس نے صہیونی دشمن کے لیے ایسے پیچیدہ منصوبے بنائے، جن سے دجالی فوج آج تک دہل رہی ہے۔ اس مردِ میدان نے صرف اپنی جان نہیں بلکہ ساری زندگی آزادیِ فلسطین کے خواب پر قربان کر دی۔ ابو عمر السوری کی پیدائش 1967ء میں کویت میں ہوئی، مگر ان کا اصل تعلق فلسطین کے علاقے طولکرم (رامین) سے تھا۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کویت میں عبداللہ السالم اور العدیلیہ کے اسکولوں میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان کا رخ کیا۔ وہ ان جوانوں میں سے تھے، جنھوں نے صرف کتابوں سے علم نہیں لیا، بلکہ دنیا کے ہر اس میدان کو اپنا مکتب بنایا جہاں مظلوموں کے خون سے تاریخ لکھی جا رہی تھی۔ فلسطین کی محبت ان کے لہو میں رچی بسی تھی۔ یہ محبت صرف جذباتی وابستگی تک محدود نہ رہی، بلکہ ایک واضح فکری اور عسکری نظریہ میں ڈھل گئی۔ عراقی حملے کے بعد انہوں نے کویت سے اردن کی طرف ہجرت کی اور وہاں سے ایک طویل مجاہدانہ سفر کا آغاز کیا۔ افغانستان، چیچنیا، شام، لبنان۔ ہر وہ میدان جہاں امت کے زخم لہو رنگ تھے، ابو عمر کے قدموں کی خاک سے واقف ہے۔ ان کی زندگی ان ممالک میں خفیہ تربیتی اور عسکری منصوبوں میں گزری۔ وہ نہ صرف میدان جنگ کے سپاہی تھے بلکہ عسکری فکر اور اسٹریٹجک منصوبہ بندی کے ماہر تھے۔ افغانستان سے غزہ تک، ہر جگہ اُن کی جرات، تدبیر اور قربانی کی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ ان تمام محاذوں میں پہنچے، دشمن سے لڑے اور سرخرو ہو کر لوٹے۔ مگر غزہ پہنچ کر بالآخر مقصد زندگی میں کامیاب اور حیات جاوداں سے ہمکنار ہو گئے۔

گمنامی سے غزہ تک:

ابو عمر 2005 میں شام سے غزہ منتقل ہوئے۔ اُن کا فیصلہ کوئی سیاسی جلاوطنی نہ تھی، بلکہ ایک خالص نظریاتی ہجرت تھی، جس کا مقصد تھا: فلسطین کی سرزمین پر جہاد و مزاحمت کو عسکری تربیت، فکری بصیرت اور جدید تنظیمی ڈھانچے سے آراستہ کرنا۔ اُنہوں نے حماس کے عسکری ونگ القسام بریگیڈز میں عسکری تربیت کا ایک جامع نظام قائم کیا، جس کی بدولت

ہزاروں نوجوان مجاہدین نہ صرف جسمانی تربیت یافتہ بنے، بلکہ فکری اور اخلاقی سطح پر بھی صیقل ہو گئے۔ ابوعمر نے عسکری اکیڈمی کی بنیاد رکھی، جہاں ان کی بدولت مختلف عسکری شعبہ جات میں تکنیکی اور سائنسی مہارتیں متعارف کروائی گئیں۔ القسام کی دفاعی وحملہ آور حکمت عملیوں، وائرڈ و وائرلیس کمیونی کیشن، زیرزمین سرنگوں، میزائل سازی اور جدید ترین عسکری تربیت کے جتنے بھی ماڈل آج غزہ میں فعال ہیں، ان سب میں ابوعمر السوری کا براہِ راست حصہ ہے۔

طُوفان الاقصیٰ کے معمار:

7 اکتوبر 2023 کو جب فلسطینی مزاحمت نے اسرائیلی جارحیت کے خلاف تاریخ کا عظیم ترین جوابی حملہ ''طُوفان الاقصیٰ'' کے نام سے کیا، تو یہ محض ایک عسکری کارروائی نہ تھی، بلکہ برسوں کی منصوبہ بندی، بہترین مشق، طویل صبر اور تیاری کا اعلان تھا۔ اس طوفان کے معماروں میں ابوعمر السوری صف اول میں شامل تھے۔ وہ اُن مٹھی بھر افراد میں سے تھے، جنھوں نے محض دشمن کو للکارا نہیں، بلکہ میدان میں اس کا عسکری غرور توڑ ڈالا۔ اسرائیل نے اُنھیں ''حماس کے عسکری بانیوں میں سے ایک'' قرار دیا۔ وہ 7 اکتوبر 2023 کی ''طُوفان الاقصیٰ'' جنگی کارروائی کے منصوبہ سازوں میں سے تھے۔ ان کی زندگی سادگی، تقویٰ اور خفیہ جہادی عمل سے معمور تھی۔ انہوں نے ہمیشہ غزہ سے نہ نکلنے کا عہد کیا تھا، اور کہا کرتے: ''جب میں اپنی بیوی اور چھوٹے بچوں کے ساتھ غزہ داخل ہوا، تب ہی عہد کر لیا تھا کہ یہاں سے صرف دو صورتوں میں نکلوں گا: یا مغربی کنارے کو آزاد کر کے، یا جنت الفردوس کو جا کر۔''

عسکری ذمہ داریاں:

شہید حکم العیسیٰ کی عسکری مہارت اور خاموش قیادت کے باعث انھیں قسام کی عسکری مجلس شوریٰ کا رکن مقرر کیا گیا۔ وہ ہمیشہ پردے کے پیچھے رہتے اور متعدد کنیتوں سے جانے جاتے: ابومحمود، ابوعماد اور ابوعمر۔ تاہم آخر الذکر کنیت زیادہ مشہور ہوئی۔ قسام کے ذرائع کے مطابق، وہ غزہ میں علم وحکمت اور عسکری بصیرت لے کر داخل ہوئے اور جنرل کمانڈر محمد ضیف سمیت القسام قیادت نے ان کی صلاحیتوں کو عسکری ڈھانچے میں بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ انہوں نے عسکری شعبوں میں کئی نمایاں خدمات انجام دیں، مثلاً: غزہ بھر میں مرکزی تربیت اور تیاری کے سربراہ، فضائی دفاعی نظام کے بانی اور کمانڈر، اسلحہ جات اور مرکزی عسکری تخصصات کے نگران، دفاعی ومزاحمتی منصوبہ بندی کی مرکزی کمیٹی کے رکن، استخبارات اور آپریشنز کے سربراہ (2014 کی جنگ کے بعد)، القسام کے عسکری رکن التدریب کے سربراہ اور عسکری مجلسِ عمومی کے رکن۔

عسکری ترقی کی بنیاد:

ابوعمر نے ایران، روس (چیچن)، لبنان اور شام جیسے علاقوں میں عسکری تربیت حاصل کی اور 2005 میں غزہ پہنچ کر قسام بریگیڈ کی عسکری حکمت عملی میں پیشہ ورانہ منصوبہ بندی، فیصلہ سازی کا منظم طریقہ کار اور دفاعی وحملہ آور تیاری کو اعلیٰ سطح پر منظم کیا۔ آپریشن ''سیف القدس'' (2021) سے قبل تمام بڑی جنگی تیاریوں میں ان کا کردار نمایاں رہا۔ انہوں نے غزہ کے نوجوانوں کو تربیت دی، ان کی صلاحیتوں کو نکھارا اور انجینئرنگ، فضائی دفاع، بکتر بند اور نشانہ بازی جیسے حساس عسکری شعبوں میں تکنیکی ترقی میں بھی حصہ لیا۔

شہادت:

''ابوعمر السوری'' نے اسرائیلی زمینی جارحیت کے دوران بھی میدانِ جنگ میں رہتے ہوئے میدانی منصوبہ بندی کی، اپنی فیملی کے ساتھ بھوک، محاصرے اور بمباری کو برداشت کیا۔ 28 جون 2025 کو غزہ کے صبرہ محلے میں ایک اسرائیلی فضائی حملے میں وہ اپنی اہلیہ اور پوتی کے ساتھ شہید ہو گئے۔ اُس وقت ان کی عمر 58 برس تھی۔ صہیونی طیاروں نے صرف ایک وجود کو مارا، فکر، تربیت اور شہادت کے جس تسلسل کو وہ چھوڑ گیا، وہ آج بھی گونج رہا ہے۔

ایک قدسی صفت مجاہد:

ابوعمر کے قریب رہنے والے کہتے ہیں کہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے عہد کا آدمی لگتا تھا۔ سادگی، انکساری، تقویٰ، جذبۂ جہاد، للّٰہیت، یہ سب اُس کی شخصیت کے نمایاں رنگ تھے۔ وہ اپنے بستر کی جگہ زمین پر سوتا تھا، اس لیے کہ آرام کی نرمی کہیں اس کے دل میں دنیا کی محبت نہ ڈال دے۔ وہ جب کسی مشن پر جاتا تو کہتا:

''میں یہاں سے صرف دو صورتوں میں نکلوں گا: یا تو فلسطین کو آزاد کر کے، یا جنت الفردوس کی طرف پرواز کر کے۔''

ابوعمر نے نہ شہرت کی طلب کی، نہ عزت کے تمغے، نہ مال کی طلب۔ اُس نے راکٹ، بندوق، سرنگ، بم اور ہر اس شے میں تخلیق کی روح پھونکی جس کا تعلق جہاد سے تھا۔ اس کا کمرہ سادہ، لباس عام، مزاج خاکسار، مگر فکر میں وہ آسمانوں کو چھو رہا تھا۔

خراجِ عقیدت:

جب کوئی مجاہد اس شان سے رخصت ہوتا ہے، تو تاریخ کا سینہ اُس کے لیے احترام سے چوڑا ہو جاتا ہے۔ ابوعمر کے بارے میں قدسیوں کا کہنا ہے:

''جب تم شہادت کی خوشبو، بارود کی تپش اور گولیوں کی گھن گرج محسوس کرو، تو جان لو کہ تم ایک ایسے انسان کا ذکر کر رہے ہو جس نے رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کفر کو ہر میدان میں لرزا دیا۔''

کچھ نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

''وہ سوار اپنی سواری سے اس وقت اُترا جب وہ ہر میدان میں گھوم چکا تھا، افغانستان، چیچنیا، شام، لبنان اور غزہ کی مٹی اُس کی گواہ ہے۔''

''اب تمہارا گھوڑے سے اترنے کا وقت آ گیا، اے ابوعمر! اب تمہیں آرام کا حق حاصل ہے۔''

صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر:

ابوعمر نے جس رفیقۂ حیات ''ام عماد'' کے ساتھ یہ سفر شروع کیا، وہ بھی صابرہ، فاضلہ اور میدانِ جدوجہد کی شریکِ کار تھی۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ اسلام، فلسطین، اور امت کے لیے وقف رہا۔ ہم نے ان سے سوائے خیر کے کچھ نہ دیکھا۔ اے رب! تو بھی ان سے راضی ہو جا۔

ابوعمر، امت کی خاموش روشنی:

ابوعمر السوری اُن شہسواروں میں سے تھے جو روشنی بکھیرتے ہیں، مگر دھوپ کی طرح چمکنے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ وہ امت مسلمہ کے ان انجانے ہیروز میں شامل تھے، جن کی زندگی گمنامی میں اور موت عظمت میں لپٹی ہوتی ہے۔ اُن کی شہادت ہمیں بتاتی ہے کہ ابھی بھی اس امت میں ایسے افراد موجود ہیں، جن کا ہر سانس، ہر قدم، ہر فکری لمحہ صرف حق تعالیٰ، اس کے دین اور مظلوموں کی آزادی کے لیے ہوتا ہے۔ ہم ان کے لیے مغفرت اور بلندیٔ درجات کی دعا کرتے ہیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے مجاہدین کے لیے نصرتِ الٰہی کی التجا کرتے ہیں۔

جبالیہ کے گھرانے کی کہانی، یوسف کی زبانی

یہ 21 دسمبر 2023ء کا دن تھا۔

وہ ریڈ کراس سوسائٹی ہیڈ کوارٹر جبالیہ میں کام میں مصروف تھا۔ یہ ہیڈ کوارٹر بیک وقت گھروں سے بے گھر فلسطینیوں کے لیے عارضی پناہ گاہ بھی تھا اور میڈیکل سنٹر بھی تھا۔

یوسف کو قابو کر لیا گیا۔ نجانے کتنے ہی اسرائیلی فوجی دندناتے یوسف کے دفتر میں آن دھمکے تھے۔ درجنوں دوسرے کارکن بھی دھر لیے گئے۔ ان میں بے گھر شہری بھی اٹھا لیے گئے۔

پہلے ان سب کے ہاتھ ان کی پشت پر سختی سے باندھ دیے گئے اور پھر یوسف کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اوروں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا ہوگا۔

پھر انہیں سدی تیا ھن نظر بندی کیمپ منتقل کر دیا گیا۔

ایک اور گوانتا مو، ایک اور ابو غریب جیل یا باگرام ائیر پورٹ۔

وہ یوسف کو کہتے رہے: ’’ہمیں تمہیں مار دیں گے۔ کوئی پوچھنے بھی نہیں آ سکے گا۔ جو سوال کریں، ٹھیک اور صاف جواب دو!‘‘

’’تم حوثی جنگجو ہو؟‘‘

’’نہیں! میں میڈیکل ورکر ہوں۔‘‘ ’’شٹ اپ! تم مت بتاؤ! ہم پوچھ رہے ہیں نا۔‘‘

پھر وہ یوسف کے بارے میں سوال کرنے لگے: ’’کہاں رہتے ہو، بیوی ہے، بچے کتنے ہیں، گھر کا ایڈریس بتاؤ، وغیرہ۔‘‘

’’میں ایک عام شہری ہوں‘‘ میں نے گھر کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔

پھر اسے چار فوجیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ آنکھوں پر پٹی پھر باندھ دی گئی۔ چاروں نے مجھے چاروں شانے چت گرا دیا۔ پھر انہوں نے نہیں دیکھا کہ بھاری فوجی بوٹ چہرے پر پڑ رہے ہیں، کندھے یا پیٹ پر، ٹانگوں کو روڑ کوٹنے والے رولر کی طرح ادھیڑ کے رکھ دیا گیا۔

وہ دمے کا مریض تھا۔ خون ابلنے لگا۔ وہ چیختا رہا، چلاتا رہا۔ اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔

کچھ گھنٹوں بعد ایک فوجی آیا اور بتایا کہ تمہارے گھر کو بم سے اڑا دیا گیا ہے۔ میں سمجھا کہ مجھے توڑنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ گھر میں تمہاری اہلیہ، نوزائیدہ بچہ اور دوسرے رشتہ دار بھی تھے۔

پھر وہ ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ’’میرے بچے، میری بیوی۔۔۔‘‘

وہ شیطان تھے، مسکراتے رہے، ٹھٹھے مارتے اور مسلسل قہقہے مارتے رہے۔

پھر ایک دن وہ یوسف کی اہلیہ اور بچوں کی تصاویر لے آئے۔ ’’اگر تم صحیح طرح تعاون نہیں کرو گے، ہم انہیں مار دیں گے۔‘‘

پھر وہ انہیں بتاتا گیا کہ آنے والے زخمی پہلے اسی کے پاس آتے ہیں۔ وہ ان کی مناسب مرہم پٹی کرتا تھا یا ڈاکٹر کے پاس بھیج دیتا۔ وہ جس بات کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے، یوسف اس سے واقعی لاعلم تھا۔

’’اسرائیلی یرغمالی شہری کہاں رکھے گئے ہیں؟‘‘

’’ان کو طبی امداد دینے تم میں سے کون جاتا ہے؟‘‘

’’تم کتنی بار گئے ہو، تم کیوں نہیں گئے ہو؟‘‘

’’وہ تمہیں کیوں لے جاتے نہیں رہے ہیں؟‘‘

بہت سے سوال تھے جن کے جوابات سے یوسف واقعی لاعلم تھا۔ پھر وہ پوچھنے لگے:

’’حماس کے کتنے لوگوں کو جانتے ہو، کس فائٹر کو جانتے ہو؟‘‘

وہ کچھ نوجوانوں کی باوردی تصاویر لے آتے اور پوچھتے!

’’یہ کون ہے، یہ کون ہے، تم کیوں نہیں جانتے؟ جھوٹ بولتے ہو۔‘‘ وغیرہ

پھر ہر نیا دن تعذیب کا، ٹارچر کا نیا انداز لے کر آنے لگا۔

یوسف کے بارے میں اوروں نے بتایا کہ وہ میڈیکل سنٹر پر مریضوں کو سب سے پہلے دیکھتا تھا۔ اس پر کتے چھوڑے جانے لگے۔ بجلی کے شاکس لگائے جانے لگے، ایسی پوزیشن میں باندھ دیتے کہ حرکت کرنا بھی ممکن نہ رہتا۔ گھنٹوں اسی طرح چھوڑ دیتے، یا ڈنڈوں، گنوں، جوتوں سے بری طرح مارتے۔ کھانا بند کر دیتے، پانی بند کر دیتے۔ کبھی کمبل چھین لیتے، پانی کے ٹب میں برف ڈال کر سخت سردی میں ڈال دیتے۔ حتیٰ کہ رفع حاجت پر پابندی لگ جاتی۔

’’میری ہڈیوں کا گودا تک جمنے لگا تھا۔ میری پنڈلیاں بے حس ہو جاتیں۔‘‘ یوسف بتاتا اور کئی بار انجانے میں کانپ اٹھتا۔ پھر ایک دن حکم ملا۔ ’’رن، رن، رکو گے تو گولی مار دیں گے۔‘‘

پھر جنوری 2024ء میں اسے کرم ابو سالم کراسنگ بارڈر پر رہا کر دیا گیا۔ رہا ہو کر یوسف نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے بھائی عبداللہ کو کسی طرح فون کیا۔ عبداللہ نے بتایا کہ ان کی والدہ چار دیگر رشتہ داروں کے ساتھ رفاہ چلے گئے ہیں۔ اس کے والد، اس کی اہلیہ اور بچیاں بھی شمالی غزہ میں کہیں ہیں۔ جب یوسف رفاہ گیا اور بھائی بہنوں سے ملا تو عبداللہ نے اسے ان کے نام بتائے۔ وہ تشدد کی وجہ سے ایک مہینے سے بھی کم مدت میں ان کے نام بھول گیا تھا۔

پھر اس کی اہلیہ کو کسی طرح اس کی رہائی کا علم ہوا۔ اب اس کے سامنے ایک اور مشکل تھی۔ وہ اپنی اہلیہ خلود سے ملنے کیسے جائے؟

یا تو وہ اپنے بیٹے کے ساتھ جنوبی غزہ سے فرار ہو کر شمالی غزہ جائے یا پھر ڈیتھ کاریڈور سے گزر کر اکیلا جائے۔ یہ دو صورت میں جان کا خطرہ تھا۔

اسے احساس ہوا کہ غزہ میں ہی سفر کس قدر دشوار ہو گیا ہے۔ پھر اس نے ایک ذاتی قربانی دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ موت کے سفر پر روانہ ہو تو بچاؤ کیسے ہو؟ پھر یہ قربانی اس کی اہلیہ خلود نے ہی دی۔

وہ پھر بے گھر ہو گئے۔

مئی 2024ء میں اسرائیلی فوج نے رفاہ پر بڑا حملہ کر دیا۔ یوسف اور اس کی اہلیہ پھر بے گھر ہو گئے۔ اس بار وہ نصیرات کیمپ میں ٹینٹ بستی میں جا پہنچے۔ یوسف رشتے میں تین بھائیوں معتز، مونتسر اور محمد سے خاصا جذباتی لگاؤ رکھتا تھا۔ یہ چاروں ایک دوسرے سے گہرے راز دان بھی تھے۔ یوسف اور ان کے خاندان بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ ان کی کہانیاں، پریشانیاں، امیدیں، جنگ کے خاتمے کی توقعات سب ایک سی تھیں۔

یوسف کے اہلیہ خلود نے اپنے لیے اور سب کے لیے خوشی خوشی کھانا بنایا۔ وہ اعتراف کرتی تھی کہ کھانے میں وہ لطف نہیں تھا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ اسے بار بار یاد آتا کہ اس کا بیٹا شمال میں ہے۔ وہ بھوکا اور پیاسا تھا۔ یوسف اور خلود کی مسلسل پریشانی بھی یہی تھی۔ بیٹے بناء کیسا لطف اور کہاں کا سکون!

یوسف روزانہ مختلف تنظیموں کے پاس جاتا کہ وہ رعد کو لانے کے لیے کچھ کریں۔ فون پر بات ہی کرا دیں۔ لیکن کوئی مدد کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔ انہیں لگتا کہ بیٹے سے جدائی مستقل ہی نہ ہو جائے، جب اسرائیلی فوج نے الرشید سٹریٹ کو باقی غزہ سے الگ کرنے کا اعلان کیا تو تشویش دو چند ہو گئی۔ الرشید غزہ کی بندرگاہ کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ یہ جون 2024ء تھا۔

خالود روزانہ کوشش کرتی کہ بیٹے سے بات ہی ہو پائے، لیکن نتیجہ صفر ہی رہتا۔ بعض اوقات انٹرنیٹ جواب دے جاتا۔ یہ بھی ہوتا کہ سب ٹھیک لگتا اور فضائی حملہ سب کو بھاگنے پر مجبور کر دیتا۔ بہت دفعہ کال فیل ہو جاتی؟ اسے یہی لگتا کہ اب دوبارہ اسے ’’ماما‘‘ کہہ کے پکارنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ ایسے میں یوسف ڈھارس بندھاتا اور اسے کہتا:

’’خلود، مایوسی کفر ہے، امید رکھو، اللہ ہمارا سہارا ہے۔‘‘

پھر یوسف کا رابطہ یونیسف سے ہو گیا۔ انہوں نے مدد کا وعدہ کیا۔ پھر انہوں نے ایک کاغذ آگے کر دیا۔ ’’اگر بیٹے کو لاتے ہوئے راستے میں کوئی آفت آن پڑی، تو وہ ذمہ دار نہیں ہوں گے۔‘‘

یوسف نے ان سے کہا کہ میں جنوب میں بیٹے کو دیکھے بناء مرنا پسند نہیں کروں گا۔ میں اسے شمال میں مرنے کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘

پھر اکتوبر 2024ء آ گیا۔ رعد اپنے والدین سے، یوسف اور خلود سے آن ملا۔ وہ اس وقت دیر البلح میں تھے۔ وہیں یوسف نے بیٹے کو پہلی بار دیکھا۔

یوسف نے بتایا کہ اکتوبر 2023ء کے بعد اسے رعد کے ساتھ رہنے کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ دونوں ملے اور ایسے کہ پہچاننا دشوار تھا۔ لیکن خون جوش مارتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور خوب روئے۔ خلود نے دونوں کو چمٹا رکھا تھا۔ وہ بھی بہت روئی تھیں۔ ’’میں تو چلنا بھول گیا تھا، مرے قدم زمین چھوڑنے سے ہی انکار کر رہے تھے۔‘‘

یوسف نے صحافیوں کو روتے ہوئے دل کا حال بتایا۔ انہوں نے بہت عرصے بعد الفاظ، ’’ماما، بابا‘‘ سنے تھے اور بار بار سننا چاہتے تھے۔ ’’بیٹا، بیٹا، پھر کہو، پھر پکارو، اور وہ دیوانہ وار پکارتا جاتا۔‘‘ ’’ماما، بابا، ماما، بابا‘‘

رعد نے پورا مہینہ لیا تب وہ کھل کر خلود کو صحیح طرح سے پہچان پایا۔ وہ اسے ماما کہنے کے باوجود اکثر راتوں کو چیختا ہوا اٹھ بیٹھتا:

’’میرے بابا، میری ماما‘‘ کہاں ہیں سب، کہاں ہیں دونوں؟‘‘

پھر 27 جنوری 2025ء کا دن آیا۔ پہلی جنگ بندی ہوئی۔ وہ شمال میں جبالیہ اپنے گھر آئے۔ یہ کوئی خوش گوار واپسی ثابت نہ ہوئی، ہر طرف گندی، ہر طرف آلودگی، ان پھٹے بم اور میزائل۔ مارچ آ گیا تھا۔

یوسف کو ہر دم رعد کی فکر رہنے لگی کہ وہ اس کا تحفظ کرے تو کس طرح کرے۔ پھر اسے غذائی کمی نے آن دبوچا۔

اب یوسف نے رعد پر پابندی لگا دی تھی کہ ٹینٹ سے باہر نہیں نکلنا۔ سکریپ میں پڑا کوئی بم اچانک پھٹ سکتا تھا۔

یوسف کو اب ٹراما کے شدید اثرات نے آن گھیرا تھا۔ اسے ٹارچر نے ادھیڑ دیا تھا۔ اب وہ اس کی تکلیف پھر سے شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔

’’میں جب کسی بیڈ کو دیکھتا ہوں، مجھے اپنی پھیلی ٹانگیں ڈرانے لگتی ہیں۔ مجھے اندھیرے سے نفرت ہے۔ شور نہ ہو تو میں سو نہیں سکتا۔ میں اپنی بیوی کے پریشان چہرے کو دیکھتا ہوں، میں اٹھ بیٹھتا ہوں۔ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ چمٹا لیتا ہوں۔‘‘

پھر یوسف نے سولر پینل کا چھوٹا سا کام شروع کر دیا۔ وہ ان کو چارج کرتا تھا۔ وہ اب جبالیہ میں ہی رہنا چاہتے ہیں۔

[بہ شکریہ: الیکٹرانک انتفادہ]

معاہدہ سیفر اور فلسطین پر برطانوی انتداب کا قیام 10 اگست 1920

10 اگست 1920 کو پہلی جنگِ عظیم میں فاتح اتحادی طاقتوں اور سلطنتِ عثمانیہ کے درمیان معاہدہ سیفر پر دستخط ہوئے، جس نے سلطنتِ عثمانیہ کی اراضی کو نوآبادیاتی طاقتوں کے درمیان تقسیم کرنے کے لیے قانونی ڈھانچہ فراہم کیا۔

اس معاہدے کی سب سے سنگین شقوں میں سے ایک تھی فلسطین پر برطانوی انتداب کا قیام، جو عصبة الأمم (عصمتِ اقوام) کی سرپرستی میں عمل میں لایا گیا۔ اس کے تحت برطانیہ کو فلسطین کی مکمل انتظامی کنٹرول حاصل ہوا اور اسے اعلانِ بالفور (1917) نافذ کرنے کا اختیار مل گیا، جس میں فلسطین میں ''یہودی قومی وطن'' قائم کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، ساتھ ہی یہ مبہم یقین دہانی بھی دی گئی تھی کہ ''غیر یہودی برادریوں کے حقوق'' محفوظ رہیں گے، ایک ایسی اصطلاح جو بعد میں جبری ہجرت اور آبادیاتی تبدیلی کی پالیسیوں کو جواز دینے کے لیے استعمال ہوئی۔

معاہدے کے سیاسی اثرات

فلسطین میں برطانوی نوآبادیاتی موجودگی کو قانونی جواز دے کر فوجی قبضے کو باضابطہ اور بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ انتظامیہ میں تبدیل کرنا۔

برطانیہ کی براہِ راست مدد سے یہودیوں کی فلسطین میں ہجرت میں اضافہ، جس کے نتیجے میں آبادیاتی تبدیلی اور سماجی و سیاسی کشیدگی پیدا ہوئی۔

عرب اور فلسطینی مطالبات کو نظرانداز کرنا اور ان کے مستقبل کے تعین میں کسی بھی نمائندگی سے محروم رکھنا۔

مشرقِ وسطیٰ کے نقشے کو نوآبادیاتی طاقتوں، خصوصاً برطانیہ اور فرانس، کے مفادات کے مطابق دوبارہ ترتیب دینا، عوام کی خواہشات کو نظرانداز کرتے ہوئے۔

بعد کے اہم واقعات

برطانوی انتداب کی پالیسیوں کا آغاز، جنھوں نے صہیونی تحریک کے لیے زمینوں کی خریداری کو آسان بنایا۔

فلسطینی عوام کی برطانوی قبضے اور صہیونی منصوبے کے خلاف مزاحمت میں اضافہ، جو بیسویں اور تیسویں کی دہائی کی بڑی بغاوتوں تک جا پہنچا۔

وہ جاری تنازعہ جس کی بنیاد اس معاہدے نے رکھی، حتیٰ کہ 1948 میں اسرائیل کے قیام اور اس کے بعد فلسطینی عوام کی نکبہ اور اجتماعی ہجرت تک جاری رہا۔

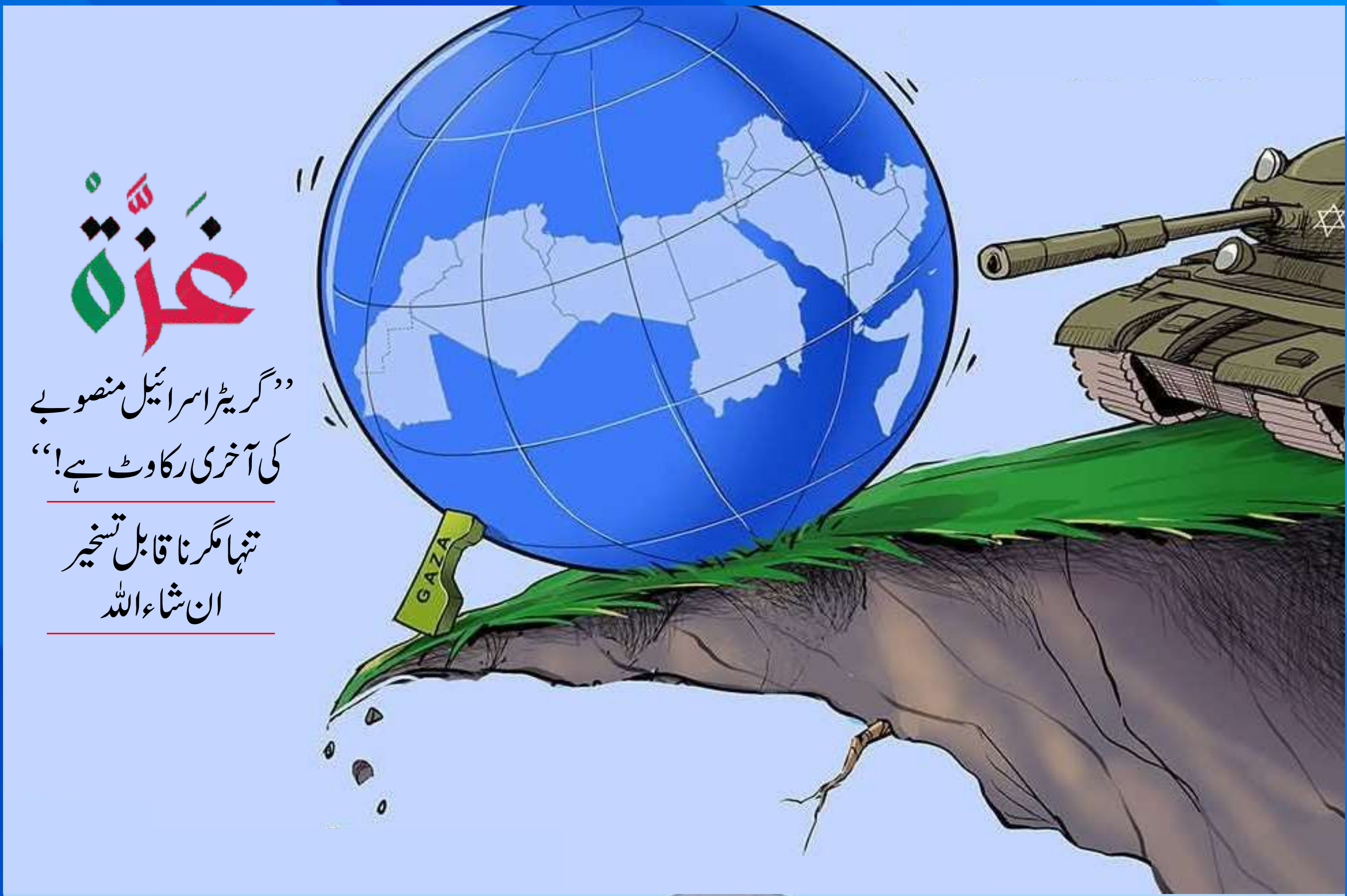
غزة
”گریٹر اسرائیل منصوبے
کی آخری رکاوٹ ہے!“
تنہا مگر ناقابل تسخیر
ان شاء اللہ
GAZA

بھوک کا شکار
غزة